

سندھ

عزیز قیسی

ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد

بیانگار داکٹر پیڈھی الدین فاسدی آزاد

سن جولی ۱۹۷۸ء

نمبر 210469

ماہنامہ سبِ رسُل حیدر آباد

جلد (۵۲) جون ۱۹۹۱ء شمارہ (۶)
مجمع مشاہد

صلت، باشتم علی اختر نائب صدیق عبدالعلی خاں
ارکان

پروفیسر گوپی چند نارنگ پروفیسر راج الدین
رمن راج سکینہ محمد اکبر الدین مددیقی محمد منظور احمد
محمد عیاذه عزازی

مفتی قسم

بھری ڈاک	بذریعہ ہائی جہاں	بیرونی مالک سے	لی پڑھے: ۵ روپے
۳ - ڈالہ	۵... ڈالہ	شرقی وسطی	زرسالانہ: ۰۵ روپے
۱۰ - ڈالہ	۰۱۵	پاکستان 'برا' سیون	کتب خانوں سے: ۶۰ روپے
۱۳ - ڈالہ	۰۲۵	امریکہ	
۶ - پونڈ	۰۱۰	انگلستان	

فائل شر
ایوان اردو بجھ گشہ روڈ چدر آباد ۳۸۲۰۵

رمن راج سکینہ ایڈیٹر پر نشر پبلیشور نسے مشینل ناٹ پر منگ پرسی کے لیے
داہرہ پریس چھٹہ بازار میں طبع کرو اکر حیدر آباد ۳۸۲۰۵ سے شائع ہے

اس شمارے میں

مختصر تبصیر	
۱	بڑی بات
۲	گوشه عزیز قیسی
۳	عزیز قیسی
۴	افادہ
۵	پروف ناخن
۶	شمیں الرحمی فاردقی
۷	عزیز قیسی
۸	عزیز قیسی
۹	عزیز قیسی
۱۰	عزیز قیسی
۱۱	عزیز قیسی
۱۲	عزیز قیسی
۱۳	عزیز قیسی (افسانہ)
۱۴	عزیز قیسی
۱۵	عزیز قیسی
۱۶	عزیز قیسی
۱۷	عزیز قیسی
۱۸	عزیز قیسی
۱۹	عزیز قیسی
۲۰	عزیز قیسی
۲۱	عزیز قیسی
۲۲	عزیز قیسی
۲۳	عزیز قیسی
۲۴	عزیز قیسی
۲۵	عزیز قیسی
شخصیات	
۲۶	سری نواس لاہوری
۲۷	پروفیسر حبیب الرحمن سریت شخصیت
نظمیں	
۲۸	حایت علی شاعر
۲۹	حایت علی شاعر
۳۰	حیدالاس
۳۱	حیدالاس
۳۲	احسن رضوی
۳۳	احسن رضوی
۳۴	خواجہ شوقی
۳۵	اقبال متین
۳۶	اقبال متین
غزلیں	
۳۷	ستاری دد دنہ سو گاتِ چشم تے جا
۳۸	دیدر پاری پہ مل کا گاہ ہو گا بھی
۳۹	کجھ اتنے بے نیاز ہوں جیسے نکے بہب میں
افسانہ	
۴۰	غلام جلالی
مطالعہ	
۴۱	بیروفی مشاہیر ادب اور حیدر آباد

چہلی بات

اس بارہ سب رس کا ایک گوشه اردو کے ممتاز شاعر عزیز قیسی کے لیے منقص لیا گیا ہے۔ عنزہ قیسی جدید دوڑ کے ایک اہم شاعر ہیں۔ وہ غزل بھی خوب کہتے ہیں لیکن ان کو زیادہ اہمیت نظم نگار شاعر کی حیثیت سے حاصل ہے۔ اپنی تحقیقات کے ذمیہ انھوں نے اس صنف کو بڑی تو انائی بخشی۔ وہ نقاد کی حیثیت سے بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے چند ہی تصدیقی مصنایں لکھے ہیں جو ان کے اعلیٰ ادبی ذوق کے آئینہ دار ہیں۔ عنزہ قیسی نے کہانیاں بھی لکھیں اور ایسے رسالوں میں چھپا گئیں جو ادب کو مقبول تر بنائے ہیں لیکن ادب میں کوئی مقام نہیں دے سکتے۔ گوشنے میں شامل ان کی کہانی پڑھ کر اندازہ ہو گا کہ وہ کتنے منحصر ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ ادب کا یہ شعبہ ان سے بخوبی تحریر کا تھا کرتا ہے۔

گذشتہ دنوں میں ملم واد ب کے کار دان سے چند ساختی اور رہنمایاں بھر گئے اور اپنی دکھ بھری یادیں پہنچے چھوٹے کوئی
اردو دنیا بالخصوص اہل حیدر آباد کے لیے مولوی حبیب الرحمن صاحب کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جس کی شدت
کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اردو زبانی کے لیے ان کی خدمات کبھی نہیں بخلائی جا سکتیں۔ آنحضرت پر دیش میں آج
اردو کو کچھ بھی مقام حاصل ہے اس میں حبیب الرحمن صاحب کے مسامعی کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ انھوں نے
اردو کے تحفہ اور ترقی کے لیے جو ثابت افہامات کیے وہ ساری اردو تحریک کے لیے مشغیل راہ بنے۔

نہایت غم دور افسوس کے ساتھ تا خیر سے ملی یہ اطلاع ہم اپنے قارئین کو پہنچا رہے ہیں کہ اردو کے ایک اہم اور نامور
شاعر عزیز مدنی ہم میں نہیں رہے۔ اردو نظم کو جدید رحمانات سے آشنا کرنے والوں میں میرا جی، ہنی م۔ راشد خوارجی
اور قیوم نظر کے ساتھ ان کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ غزل میں بھی ان کی منفرد اولاد تھی۔ اردو شاعری کو ان کی وفات سے ناقابل
تکونی نقصان پہنچا رہے۔

گذشتہ ماہ ابھرتے ہوئے مزاج نگار شاعر بوجس حیدر آبادی کی جوان مرگی سے اہل حیدر آباد کو جاں کا ہ صدمہ پہنچا
ایک زندہ دل اٹھ گی اور ساری محفل کو ہسو گوار کر گیا۔ جدید اردو نشریں مزاج نگاری کی روایت نہایت مستلزم ہے لیکن شدوں
میں مزاج کے نام پیدا نہ آئی عام ہو گئی ہے۔ دوچار شاعری ایسے ہی جنہوں نے مزاج کو ابتداء سے بچا کر رکھا انھیں میں
بوجس حیدر آبادی بھی تھے۔ وہ بڑی صفتی کے ادبی حلقوں میں اپنے مزاج نگار شاعر کی حیثیت روشناس ہو رہے تھے اور ان سے
بڑی توقعات غالبہ تھیں۔ (آخر ص ۲۳ پ)

عزمی

اصلی نام عزیز محمد خسرو
پیدائش یکم جولائی ۱۹۳۱ء۔ حیدر آباد
جی۔ اے تعلیم

ملازمت ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۸ء عدالت خیفہ حیدر آباد میں ملازمت کے پرستنے کے کام میں ملکی طبقے گئے۔

فلم سے وابستگی بھئی میں کچھ دنوں صحیفہ نگاری کی پھر فلم سے والستہ ہو گئے۔ فلموں کے یہ کہانیاں، اسکرین پلے مکالے اور جگہت لکھنے رہے۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۲ء تک فلمستان اسٹودیو میں ملازم رہے۔ بعد ازاں آزاد انہ طور پر فلموں کے یہ گفتگو کہانیاں اسکرین پلے اور مکالے لکھنے لگے۔ تقریباً چالیس فلموں کے یہ انہوں نے لکھا جن میں انکور، گنووار، یاری دھمنی، خون کار شستہ، آخری گولی، جادو ٹونا، تھیف آف بغداد، نشان، گنگا اور سورج، اپنے اپنے اور دیاوان شامل ہیں۔

دیگر مصروفیات فلم رائٹر اسوسی ایشن کے نائب صدر رہے۔ ڈپیوٹ شکنٹ کمیٹی کے پندرہ سال تک صدر رہے۔ مصطفیٰ اور موسیقاروں کی انہیں تو انہیں پرفارمنٹ آرٹس سوسائٹی (ملحقہ انٹرنشنل کانفیڈرنس آف آفیسرز اینڈ کپوزرس) کے بورڈ آف ڈائرکٹریس کے رکن بھی ملک اور بیرون ملک متعدد کانفرنسوں اور سینما روں میں حصہ لیا۔

اعزازات ۱۹۸۹ء کا ہمارا شٹرا اردو اکیڈمی کے اسٹیٹ اوارڈ کے علاوہ دیگر اکیڈمیوں اور پھر انٹیلوں کے انعامات اور اعزازات حاصل کیئے۔

تصانیف آئینہ در آئینہ (مجموعہ کلام) ۱۹۷۲ء

گردیاں (مجموعہ کلام) ۱۹۸۵ء

دوسرے کنارے نگ (ناول) ۱۹۸۳ء

اس کے علاوہ ان کی کئی کہانیاں، ڈرامے، تقدیری مفہایں وغیرہ پر مختصر کے موقر جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

یوسف ناظم

ہم اپنی اپنی ظلمت اپنی اپنی روشنی خود ہیں!

قد و فامت کے اعتبار سے معقول اور دکھائی پڑتے ہیں اور کہیں ملیخہ جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ماں کوئا بٹھا ہوا ہے۔ چاہیں تو بہتوں کو بٹھا دیں۔ جب بھی ورنہ بڑھانا چاہتے ہیں بلڈ پر شرپ بٹھا لیتے ہیں۔ اپنا اور دوسروں کا بلڈ پر شرپ کیا زیادہ کرنے کے اہر بیان سے ہر یہ صحت بھاڑکیتے کی ترکیب اغصیں آتی ہیں اور وہ قتفے سے انھیں آزاد کر رہتے ہیں۔ لیزی تو ہیں ہیں لیکن لاپرواہ ہونے میں ملکہ ماحصل کرنے کی فکر میں مسلسل لگے ہوئے ہیں۔ داہن کوئی اور ملکہ انھیں بلف سے رہتا ہے تاہم قطعی طور پر کچھ ہیں کہا جاسکتا، برسوں سے اپنا جموعہ کام پیش کر رہے ہیں۔ اس جموعہ کلام کی سب سے بڑی غلبی پہے کہ اس میں کتابت اور طباعت کو کوئی لفظی نہیں ہے کیوں کہ اب تک لکھا ہی نہیں گیا ہے۔ کئی سال پہلے انہوں نے ایک نظم کہی تھی "آئینے سے یہ نظم لوگوں کو بہت زیادہ پسند آگئی (اتفاقات ہیں زندگی کے!) اب عزیز قیسی نے اپنے جموعہ کلام کا نام ہی "آئینہ در آئینہ" رکھ دیا ہے۔ (کافی اچھا ہام ہے یقیناً انہوں نے جھس سے مشورہ کیا ہو گا)۔ ایک جموعہ منقرب ہی یعنی کوئی پارچہ دس سال میں شائع ہو جاتے گا۔ اس سے زیادہ دیا بنا نہیں لگے گا۔ عزیز قیسی کی دوسری یادیتی یہ ہے کہ کہانی نویس بھی ہیں۔ کہانی لکھنا اور شعر کہنا دو مختلف ڈپارٹمنٹ ہیں لیکن جب احمد ندیم قاسمی یک سکھتے ہیں تو اور کوئی کیوں نہیں کر سکتا۔ عزیز قیسی اصل میں

0 عزیز قیسی کا یہ صرع خود ان پر بہت زیادہ کھلتا ہے۔ اب اس جو میں معنی ملاش کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔ صرف صرع میں جو معنی ہیں ان پر خود کیجیے [] میں لہا پر جرک کے یہ مانند کے لیے تیار ہوں کہ عزیز قیسی قابلِ ادب ہیں لیکن یہ مانند کے لیے خود کو کیسے تیار کر ہوں کہ وہ مانندی قابل ہیں جتنا کوئی وہ خود بیان کر سکتے ہیں۔ ان کی صورت سے ذہانت ہی پسکی تھے مگر بعد بعض وقت قاتلی ٹیکھتی تھے کہ وہ خود تر ہو جاتے ہیں۔ تو جو ہوں اور ان کی عمر کے ادمیوں کے لیے اتنی ذہانت بہت ہوتی ہے۔ ان سے باتیں کرنے کے بعد یہ بھی خوش ہوتا ہے کہ عمر کے ساتھ ان کی ذہانت میں مزید اضافہ ہو گا۔ (عمر کا بڑھنا تو بہر حال بستی ہے) رہا ذہانت کے بڑھنے کا مسئلہ تو یہ ان کی صحبت پر مختص ہے، اگر عزیز قیسی اتنے ہی تھاں ہیں جتنا کوئی خود سمجھتے ہیں تو ذہانت کو نہ کر کے انداز میں نکھر کر تباہی یا کوئی ہطل اور بے وزن نظم کہہ کر بتا دیں۔ زمانہ اتنی ترقی رک گیہے۔ لیکن عزیز قیسی بغیر وذکر کے صریح کہنے کی صلاحیت پیدا نہ کر سکے۔ سچ ہے اور میں کوئی نہ کوئی خامی مزروعہ نہ تھے۔ عزیز قیسی انظنم اور فرشہ دنوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں اور یہ ماننا پڑے گا کہ ان کا ہاتھ بہت صاف ہے۔ مفتراء بھی ہیں بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ داعظ ہونے کے جراثم سے بھی ان میں داڑ مقدار میں موجود ہیں۔ ان کی نظر شاید ان جراثموں پر نہیں پڑی۔

شہریں نہیں بجائے فرد شوکیں ہیں اور کیا تجویز گئے جو کہ شوہم میں
تبلیغ ہو جائیں۔ اگر نہ املاک اس سکرپٹ کا ہائیلائٹ ہیں
ایک ہاتھ سے ہا سب کی وجہاں تکشل کا ہے۔ جو نہ قسمیں کیا تھیں اور ورنہ
ماقفل سے بچتے ہوں گے۔

عزیز قیمی نہ صرف فارسی کے بلا عنی کے بھی شدید مالکیت مسلم
ہے ہیں، کسی زمانے میں شاید اخونے نے ادبِ فارسی بھی پڑھا ہو۔ مظاہر
کا بہ بھی خوق ہے اور انگریزی کی فشن نادیں بہت بیل لگا کر پڑھو۔
شکل سے ابھار بھی پڑھتے ہیں، یقیناً پڑھتے ہوں گے۔ دُنیا کا ہر معیوب کام
انھیں بہت مرغوب ہے۔

فائدہ یا بھی نظر کو اپنی نظر پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی بنا پر کوئی
محتوا درج نہیں ہے۔ ملکی ہے یہ نظم سوچ کر کہتے ہیں۔ سوچ کر قلم لگتے
بڑی بات ہے بھی نہیں لیکن نظر لکھنے میں کچھ دلچسپی داغ قویہ استعمال کتے
ہیں ہوں گے۔ پھر ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا کیا سمجھیں؟ بھروسے پوچھ جائے
 تو میں اس صاف ہیں کہ اسے نہیں دوں گا۔ آدمی کو بیرونی کی ناجاہیے۔
جب پوچھ جائے تو کبھی ایسی رائے نہ سے بہوں عزیز پر بچہ ہر جگہ اپنی بانے
 دیتا پہنچے۔ عزیز قیمی کو بیاپسے پر کہیں وہ اپنی نظم کوں کو نظر لکھدی
 پر ترجیح دیں تو کبھی نظر لکھاری کو شرعاً کوئی پر — یوں بھی کہا گیا چکا
 دروغ کو راحافظ نہیں۔

عزیز قیمی اگر لب لات اپنی نظیں ادا کرنے جوئے تاریخ
 جیسے مدنی میں بخسکتے ہیں، تا خصیں برتر محس کرنے چاہیے اور انہیں بھی
 لسیسوں نظیں کہنی ادا کیے جیسوں محسیں بچتے ہیں۔ نظر لکھنے ای
 ہندوستان میں معیوب نہیں ہوا چاہے۔

عزیز قیمی اپنی کفتوگی سے دھرمی اکار و قوب کرنے میں کوئی عار
 نہیں بچتے غافل شارے سے بھی اپنیں بڑھی رطبت ہے۔

ضفیل اور مٹھوڑیں جاتے ہیں تو ہر کسی کی بچنے پڑتی کو کر ضرور
 دیتے ہیں اور بندوں سے دیجئے والے یہ بچتے ہیں کہ لوگ ان سے

شمس الرحمن فاروقی

گردو با دل نشوونما

بشق دیا تھا۔

یہاں میں نے عزیز قیمی کے سیاسی خیالات کی بحث صرف اس پر اٹھائی کہ ان خیالات کے مالی شخص سے جس طرح کی شاعری متوقع ہے؟ عزیز قیمی کی شاعری اس طرح کی ہے نہیں۔ ان خیالات کے مالی شخص سے کس طرح کی شاعری متوقع ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کی چند اس ضرورت نہیں۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ ایسے شخص کی نظر میں شاعری وہ عمل ہے جس کے ذریعے لوگوں کے عقائد کی اصلاح کی جاتی ہے۔ عزیز قیمی کے سیاسی عقائد اور ان کی شاعری میں جو تفاوت ہے اس کو تفہاد کہہ سکتے ہیں۔ اور اس تفہاد کی وجہ میں اُن کے تصورِ شعر میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ یا پھر اس تفہاد کو ترقی پسند فکر کی ناکامی اور اس کے کھوکھلے ہوئے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ لیکن نی احوال بھی ان باتوں سے بھی فرض نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ کسی شاعری سے بطف اندر زیست کے لیے بجا نا ضروری نہیں کہ اس شاعر کے سیاسی عقائد کیا ہیں؛ اگر وہ سیاسی عقائد اس کے کلام میں منکس ہیں تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ اور اگر منکس نہیں ہیں تو اس پر خوش یا ناخوش ہونے کا بھی کوئی محل نہیں۔ دیسے بھی میں ترقی پسند طرزِ ننکا اور طرزِ شردوں سے اس درجہ مایوس اور مطمئن ہوں کہ اگر مجھے عزیز قیمی کا کلام سنکہ بند

عزیز قیمی کی شاعری کی عمر تقریباً چالیس برس ہے۔ یعنی انہوں نے اس وقت شعر کہنا شروع کیا جب ہمارے یہاں ترقی پسندیں کاؤنٹر کے حیدر آباد میں خاص کر مخدوم کا بول بالا تھا۔ ترقی پسندیں کے پروگرام میں سب سے زیادہ دلکش چیزوں کے لئے اہمیت تھی جن کی چک دمک اور نے میں ابھی جنہیں باقی تھے، "عوام، انقلاب، امن، عالم، استبداد کے خلاف جنگ جہد" یہ مفریزے اور کلیشیزے چونکہ قومیت اور ملتمامی تھے۔ بالاتر تھے۔ اس لیے ان میں ان لوگوں کے لیے خاص دلکشی تھی جو عزیز قیمی کی نس سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے قومیت کے نام پر انسانیت کو قربان ہوتے دیکھا تھا۔ ترقی پسند خیالات کا اثر عزیز قیمی پر بہت گہرا اپنا۔ اتنا گہرا کہ اب بھی جب ہد ترقی پسندیں کو مشرقی پورپ اور خود روں میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کے باعث کہیں بھی نظریاتی پناہ نہیں مل رہی ہے۔ عزیز قیمی یہ کہہ سکتے ہیں (جیسا کہ انہوں نے ابھی ایک رسالے میں لکھا ہے) کہ مشرقی جرہی اور سعادتیہ غیرہ میں جو جہد رہا ہے اور ہوا ہے وہ سب ما رکزیم ہی تھے۔ کیوں کہ (بقول عزیز قیمی)، ما رکزیم نے ہی دہان کے لوگوں کو جمہوریت اور عوامی انقلاب کا

بے کارِ جدیدیت پر لفتگیر بکھرنا بھروسہ
تم پر بخت ہوئی تو بھرستہ کا جائزگر نہیں تھا۔ نہ لیوں
یہ ہے کہ ہر شخص کا پانچ حصہ اور ایسا کار منسی و تھہ سادیہ
مشتبہ ہے کہ وہ ادب یہ بحث کرنے نہ کر انتسابیات
اور علمی ذرا وقت میں نامنگ ادا نہیں۔ جو تجھجاپ یہ ہے کہ
بتول کلود سینون (CLAUDE SIMON) ادبیت
دری ہمروں میں کوئی رومنی تیکن تو ہوتا ہے۔ پاپخان جب
یہ ہے کہ ادب پیدا کرنا انتقام سیدا کرنا مذاقِ الہ مذکور
کا چیز ہیں۔ ایک کو صریح تریکی نہیں ہے۔ والد جسیں۔

WALTER BENJAMIN، نسبت کی ایات کی تحریک کر
جیدیت پیداواری رشتوں کی بعد شنی جس مسترد (MUTTERD)
کو روشن بنالیا گیا ہے۔ اب ادب بجا اب کوڑا کسی سوسنہ
چھٹپتیش کا مرادی تھی کہ ادب کوں رومنی و افسوسان مردنی
ملائیں۔ پھر پیداواری قوانین کا کام لایا ہے۔ یعنی ادب کی
لینیں جن اصول پر ہے جس کے اسیں بھی انتقادی اصول کی
روشنی میں بھیجا جاسکتے۔

بہر حال اگر دنار میں عزیز قسم نے اپنی ۱۹۴۰ء کی تحریک
”آغازی“ شانی کر کے شاید یہ کہنا چاہیا ہو کہ در وہ ان لوگوں
میں سے نہیں میں جو نات و درود کائنات جنمیں کی تھیں۔ وہ
پاؤں تھے کے بل وہ تھے پر خاتمی کیں اسلام کی مژدویات
در وہ لوگوں کا اور مکان (کو ظفر انہا کر دیں۔ یہ تو جس ماتحت جوں کر
ان کی شاخی میں ترقی پیدا کر کے پاؤں تھے جسی نہیں تھے
یہ اس تو عزیز قسمی بھی نہیں تھے کہ ترقی پیدا کر کے پہنچا
تھوڑات جیدیت کے زیادہ جائے۔ دی تھا تھی بھی۔
دیکھی ہے کہ اگر اس قسم کا اندھر عزیز قسم کا تھا۔ آغازی میں
رُوئیں گے معاویہ یونیک کے تھوڑات جیدیت کے پہنچا

لٹریشن کے منتظر اور بھت دو نظر آتی ہے تو مجھے اس سی
کہنا تجھب بھی نہیں اور عزیز قسمی کوہیں پہنچیں تیکیں برسر سے پڑھتا ہوں
بلانے ہیشان کو جیدیت شاہزادی اور مجھے اس میں کوئی تقدیر نہ
عوਸ ہوا کہ عزیز قسمی خوش تھیں مارکی بھی ایں اور جیدیت شاہزادی بھی ایں
میں تو خود ہمارے سے یہ کہتا رہا ہوں کہ جیدیت کی پہنچی خود رہی ہے تو
شاہزادی کسی بھی سماں حلقہ کا باہندہ ہو نہ پر بھورنے کی وجہے اور
اسے اس بات پر مجرور کیا جائے کہ اس کی شاہزادی کسی بھی سماں یا سماں
پر گلام کے اصول پر پوری اُڑتے۔

بعزیز لوگوں نے عزیز قسمی کے بھیجے کی جیادی صفت ”بلانا ہیگی“
تاریخی سے۔ خود عزیز قسمی کو فانیاں سے اتفاق نہیں گیوں لا لازمیا
کے دیباچے میں وہ لمحتے ہیں نیز الہم بلانا بھک پسند قادری خودی
دے سکے ہیں۔ میں اس بھیجے کو بد لمح کی کوشش ہے، انہیں کرتا چاہے
نقدی میری شاہزادی کو راست جوان کی شاہزادی کہیں یا تو کلا مسکت ہے
یہیں اس پر لگائیں یا قدمات پرستی کا۔ میں اس آغاز میں اپنے
اپ کو ظاہر کر دیا گوئی آغاز ہے؟ اس بیان سے اعد کچھ ثابت
ہوتا ہو یا نہ ہو۔ میں اس اخاذ در عقاہ ہے کہ عزیز قسمی روایتی قسم کے
تلے پسند نہیں میں اور روایتی قسم کے جیدیت بھی نہیں۔ یہ بات البته کہ
بعض اولادت عزیز قسمی خود کو ”جیدیوں“ سے الگ کرنے کی شوری
کو شکر کرنے میں اور وہی ان کے سب سے کم زور لمحات ہیئت گرد بادا
کی سب سے زیادہ فیروزی بخش تھا جو اسی ہے جو اس ”جیدیے“ نات اور
درب کے تھے مخفی سوالات ہیں کم میں اندھام کا ہجوم پاں اور روشن
و غیرہ کی تکلار کر رہے ہے۔ اس پر مجھے ڈاکٹر نسٹو محسن کی بات یاد آئی کہ
المخون نے ۱۹۶۲ء کے عمل گڑاہ سینا میں کہا کہ بیٹھاں میں قحط پڑیا ہے
اور آپ لوگ جیدیت کے اتنی یہ بحث کر رہے ہیں۔ اس کا ایک
جو اپنے قدر ہے کہ طرد ڈاکٹر محمد حسین بھی وہاں جیدیت پر گفتگو کرنے
آئے تھے، قحط زندوں کے لیے جنہے مانگئے گھبیں۔ دوسرا جواب یہ

جن ۱۹۹۱ء

۹

بعد کے شواپنچہ پیش رودؤں کے اثر کو محض کر تے اور اسی
آنارچی کے انی الفرادیت قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن پیش
رودؤں کی سائنس ان کی آمادی پر بہر حال سنائی دیتا ہے۔ جوں کے
خیالات کا پیشوے ہے کہ جدید اور قدیم کے درمیان یک لکھ مخالفانہ
اور شرعاً کو مبدہ و جہد اُنارڈی میں مبتلا رکھتی ہے۔ لہذا اس شاعر کے
یہاں الفرادیت کی نشان دہی کرنا دعا صل اس کے ساتھ فتنہ کا رابطہ
کیوں کروئی بھی شروع دعا صل منفرد نہیں۔

اس کے باوجود تم لوگ الفرادیت کو بہت اکم قدر مانتے ہیں
اور اس کی تلاش میں سرگردان رہتے ہیں میں تو یہ کیوں لا کا پیش
ہزاہ پیشہ مزدور کا ہے جب کہ منفرد ہونا ہیشہ مزدوری نہیں۔ بلکہ
اندب یہ ہے کہ جو اپنے ہو گا وہ کسی نہ کسی طرح منفرد بھی ہو گا۔ لیکن کہ
اچھائی کے ظاہر چونے کا ذریعہ نیپارے کی ہبنت ہے اور بہت
اس حقیقی میں ~~UNIQUE~~ ہوتی ہے کہ اگر وہ بہت زمینوں پر
بھی نہ ہو۔ عزیز قسی کا یہ کہنا تو تھیک ہے کہ ہبہ یا اسلوب تُم
بالذات نہیں بلکہ تجربہ احساس (وغیرہ) لیجے اور اسلوب کا تعین
کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی اتنی بھی تھیک ہے کہ تجربہ احساس
وضرع (غیرہ) بھی فائم بالذات نہیں۔ اسلوب نہ ہو (یعنی بہت
نہ ہو) تروہ بھی وجد میں نہ آئیں۔

میرا خیال ہے عزیز قسی نے ”گرد باد“ کے دیبلچے میں الفرادیت
اسلوب ممنوع اثر وغیرہ کی کات جو اس کثرت سے کہے تو شاید
اس وجہ سے کہ انھیں خوف ہے زمان انھیں سمجھے نہ جھوڑ گیا ہو۔
جس طرح وہ خود ترقی بہندی کو سمجھے جھوڑ گئے ہیں لیکن ”جوانانِ
فخاست“ کی بھرپور شامل بھی نہیں ہونا چاہتے۔ لہذا وہ خوش ہوں
یا ناخوش ایکن میں ان سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ابھی شاعری زمانے
کی تابع نہیں ہوتی۔ اور یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ان کے داخلی ریل
دینی وہ مسائل جن سے وہ اپنے وظیفہ شاعری کی ادائیگی کرے

دو فون ہوئے (اصحیدہ کیونٹھ ہو لے کا شرف رکھتے ہیں۔
بلکہ ہمارے ہمراہ قسمی کی ہی نہست تھیں کہ وہ اپنی آوازیں
کلام کرتے ہیں۔ کہیں اور کے راگ پر نہیں گاتے۔ لیکن وہ بھی پہنچے
اصل دنماقابل جوش، اختر شیرانی اور صحابہ سے متاثر ہونے کی
بھی بات تکھے۔ داں کی فہرست ہیں اور بھی نام ہیں لیکن نہیں
کے لیے یہ کافی ہوں گے، اب اگر یہ کہوں کہ اقبال کے تھوڑے
بہت نشانات کے ساتھ ہوئے جسکی پہاں شاعر دن کا پہنچاں
نظر خدا یا جو کہ نام المخلوق لے دیا تو فہرست کیے ہیں تو ممکن ہے
وہ نال قسم چلے اور بھی پر سخن نافہم ہوتے کہ انہا کر کیں۔ یہ بات
تو یقینی ہے کہ عزیز قسی ان تمام شعر کا اپنے روایتی پیش رودؤں
میں شمار کرتے ہیں جن کے نام انہوں نے لکھاے ہیں۔ لیکن اپنی ~~حکی~~
کو ان لوگوں کے اثر سے دور رکھنے کی کوشش اصل ملے غالب
غیر شعری مدد پر کی ہے۔

ہمارے زمانے میں الفرادیت کو مثبت قدر کے طور پر
دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم کلامیک شاعر کے یہاں بھی الفرادیت
تلاش کر لیتے ہیں۔ حالاں کہ انکے یہاں اس قدر کا مثبت
یا منف (وجہ میں نہ تھا اور تو اور جو مغرب میں بھی لاٹھار دیں
صدی کے ~~ENLIGHTENMENT~~ کے پہلے جب فرد
اور سماج کے رشتہ متعین اور مستحکم تھے، الفرادیت کی کوئی
خاص اہمیت نہ تھی۔ ہریلڈ جوم ۱۸۰۰ء میں THE ANXIETY OF INFLUENCE
اپنی کتاب ~~ENLIGHTENMENT~~ کے پہلے مختصری شاعر کے
یہاں اثر (INFLUENCE) کا کوئی تصریح نہ تھا۔ اُنھا اپنی
صدی کے بعد الیتہ پر صورت حال پیدا ہوئی (اور اسیج تک
باتی ہے) کہ شاعر اور اُن کے پیشی زنؤں کے درمیان اپنی پیش
ویہاں اور اس کے پاب والی آوزیں خش ہونے لگی۔ یعنی

جوتا رون کی پیدا تھوڑی بڑی تھی اور پہنچتی تھی
وقت کا معلم ہے جو اپنی آنہ دن ہے اور دن کو پہنچتے ہے
شب و در زمین کا ریخ نکل پائی جاتی تھی۔

یہ سب کچھ ہے میں کسی اس کے باوجود تکمیل کا لٹکتی ہے
تکمیل میں جو لٹکتے ہوئے کاروباری پر گرفتار ہوئے
اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اب لٹکتے کا وعده تم ہو گئے
لاش کی جو نہ تھیں جو میں تکمیل کا لٹکتے ہوئے
وہ اجل رسیدہ ہیں اپنے مریکا نہیں کے ہوتے اس کے زخم
کو درود ہذہن کو جبکہ وہ سی جستا کرتی ہیں۔ فرمدی خوش گزیدہ
کہ جن پہنچنے والے اسات کی تباہی کو راشد میں لٹکتے کے
مالک ہیں جسیں اور زمان کے جو گھر پر پڑ کیے
چکار ہے میں جانیں جہاں مشرق اور طرب کے دریاں کا بہلہ لیکے
اکٹھے جائے جہاں زندگی کے سخت مالک کے ہی ہے جو سختی ہی
بے خود ابھی ہمدا رہو۔ یہ بات ۱۹۴۵ء کی ہے۔ ۱۹۷۰ء
آتے آتے راشد کو آجڑے من و نبھے والی اندر کے ٹھاٹ
اکٹھے جب وہ بھکھتے ہیں۔

اجل ان سے میں

کریے سادہ دل
نہ اہل صلة اور نہ اہل شراب
نہ اہل ادب اور نہ اہل حساب
نہ اہل کتاب ...
نہ اہل کتاب اور نہ اہل شری
ناہل خلاف اور نہ اہل زمین
عقل بدلیں

دستور

— شہر کی ضمیموں پر —

دد مان دو جاہر ہے میں) ان کے قاری کیلئے چند الگ ہمہیں۔
ان کی آواز میں وہ اپنی ہے اس کے مرچختے افسوس انکا رقصہ تھا
میں ہیں جو جب دیلوں نے نام کیے۔ عزیز قیسی اپنے بزرگی کی
فہرست میں جوش کو تھیں یا اٹھتے تھیں اس کو یہیں حقیقت پہنچا دیا میں
یہ ہے کہ ان کے اصل پیشواں نم۔ م۔ راشد اور اخڑا ایساں ہیں۔

فرق صرف یہ ہے کہ جہاں راشد سیاسی کاروبار میں اگری پر پہنچا اور
انسان کے سبقت کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہیں اور جہاں
اخڑا ایساں زمانہ کا تھا اور سماج کو معاہدوں اور مفاہموں کی
زنجیریں گرفتار دیکھتے ہیں، عزیز قیسی کو انسان کے مرتبے کے بارے
میں خوش فہمی ہے کہ وہ تاریخ کا بارگزار اٹھا سکے گا۔ ہمیں کہ ان کی
نظر "تاریخ" میں ہے:

یہ تاریخ اورات میں انسانی ترقی کو ہوئے کے پہنچوں
سرافیں کا صور گوئے کامیں کا پتہ اور دشمنوں کی اسی سے
آخری سیکارہ خوں جو تھیں نے چھالوں کا باندھات
تمھیں دے کر رہا ہوں ۱۸۵۰ء کا اُنگ تھیں تو انہیں
اپنے ہاتھوں کا حلقوں بنھائے ہوئے بارگزاری سے پوچھو
کہ ہزاروں ہجہن ستاروں کو انھوں کے جلتے ہمیں

میں پوچھتی ہے کیا وہ نہیں جانتے۔ یہ تاریخ ہے۔

اس نظر کی سب سے بڑی وقت اس کا پیغمبر از الجہاد اور اس
کی کفایتِ الفاظ ہے۔ یہ بعض اتفاقات نہیں کہ تکمیل کے صرعنوں کی الگ
کرنے کے لیے آبتوں کا گول نشان اختیار کیا گیا ہے۔ اس نظر کے
اعمل میں یہ نشان RETENTIOUS نہیں بلکہ استفادے
کا لام کرتا ہے۔ یہ نشان اس بات کا استفادہ ہے کہ تکمیل کی طرف و
تاریخ کے طور پر یہیں بلکہ امکث نہ تاریخ کی سطح پر پڑھ جائے۔ نظر
کا پیغام بہم ہے ایسی آنامز در غلام ہر ہے کہ تکمیل کا ختم وہ استفادہ
کا لام ہے جو تاریخ میں جاہری و ساری ہے۔ اسی اگر ان تاریخ
کا بوجہ اٹھانا چاہے تو فرد تاریخ اس کو سہا نا ہے گی۔ وہ بارگزار

دیکا یہ سایہ تھا پاک ہو گیا آفر
رات کا ہادہ بھی
پاک ہو گیا آخوندک ہو گیا آفر
از دام انسان سے فرد کی فاؤن
ذات کی صدا آئی
راہِ خود میں جیسے راہروں کا خون پچکے
اک نیاجوں پچکے

(زندگی سے ڈرتے ہیں)
تو ہمیں ایک بیب سے کھو کر پن کا اساس ہوتا ہے۔ لاث
کے یہاں آہنگ کی جو دنی اور کیفیت سے بھروسہ شدہ
اس کی بنیاد پر تطبیں تباہ ہونے سے پچ تو تخلیٰ ہیں ایسکن ان کا
زور بیان غالی از مغرب معلوم ہوتا ہے۔ اب انھیں راشد کو
ان نظموں میں دیکھیے جہاں تشکیل یا حزن یا خوف ناب
زندگی کا دلوں یا برائی (پچھے بطرس نے درشن کہا تھا) کا دور
دور ہے۔ ایسی نظیں ہمارے زمانہ کی آواز ہیں، کیوں کہ
اُج تام انکشافات کا پردہ فاش ہو گیا ہے۔ اب ہم اکٹھے
زیادہ دل دوزی اور دل سوزی کے تناولی ہیں۔

درختوں کی شاخوں کو اتنی خبر ہے
کہ ان کی جڑیں کھو کر ہو گی ہیں

گن میں ہر شاخ بزدل ہے
یا مستلا خود فربی میں شاید
کہ ان کے خود رہ جڑوں میں
وہ اپنے یہ تازہ نہ مددوٹی ہے!

(نارسائی)

نہیں۔ ہم جانتے ہیں
ہم جو نارس بھی نہ دیدہ بھی ہیں

جانستے ایں کہ نسل ہے عجب ہے مرد اسی۔
کس بیٹے نہ سے۔ بیٹت سے
پاک تسل سے جسم بنائی
اور سیرت کی تاریخ پیوں کی کری
ختم سالاں کا تیسرا بند بارکری
سچی تحریک کا آغاز کریں! (یخدا پر زخم)

اگر یہی پڑھتا ہے الٰہ کلم پڑھے یعنی تم ہمکاری کی
کامیابی کا ساتھ اور زندگی کے گورنمنٹ پر کسی نہیں
اور غیر فرمودہ لا یہاں کے بیرونی مصالح ہو سکتے ہے۔
یہاں شہر ہے ہوری یہیں کی طبیعت میں اور ملکہ نہیں کا ساتھ
کی نظریں، "نارسائی" اور "بند بارکری" میرے دل کو سچی تحریکی
قاچیں، اسی بات ہو جو اتنی قیامت نہیں۔ تحریکی بات یہ ہے کہ تم
"نارسائی" میں ہو رہ تھیں تھے اپنے کاڈیا مائیت اتنا اصلب میں
کفاشت افادت کے ساتھ شدت حاصل کر لے رہے۔ یقین آج کے لئے
کچھ نہیں کہتی۔ یہاں اس کے استوارے اور بیکاری سے یہ مزور ہے کہ
ہیں کہ اگر یقیناً اپنے اختیار کرنا ہے تو تم جیسے پیکوں اکٹھوڑا
کو اختیار کیے بیرونی طارہ ہیں۔ "بند بارکری" استوارہ بھی ہے اور اسے
بھی اور تحریک کا اصولی حکمت بحدود ایسیں کے چاروں کی خاکہ خلائق
بیان پریکی جس میں حکمت الس ابعاد اور ذات اور سب درجہی یا ان
بگری خودی نہایت متعلق ہے ایسکن بیانی باتی ہے کہ پریتھم
"بند بارکری" کو کوئی یقینیت حاصل ہے۔ "بند بارکری" اسی کی
کا استوارہ بھی ہے اس انسان سہارے کا بھی، اس کو جلا جی پر جو اس
ہے اسی وجہ اسی وجہ اسی وجہ ہے۔ چونکی وہ اسکی ایشان کر
عہد نہ کر سکتے ہیں اسی میں ہر جان بھی ہے۔ اور اسی میں ہیں
بھر جو کل طیں رہنگی اور کتاب بھی جن جہاں جو ہے یہ تحریک اسکی کا

کیا گیا ہے یہ دو فون نکلیں ڈنایا اپنے ہمارے اور خود گئیں پیکر
نگاری کی زبردست مثالیں ہیں۔ عزیز قسی خود کو دُنیا اور دنیا کا ہے
اگر دیکھتے ہیں لیکن انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ اگر وہ
خود نہیں قوانین کی نظموں کا تسلیم نہیں دنیا ہوں دنیا اور دنیا کا ہے
میں اس طرح ملوث ہے کہی جیزیں اس سے الگ ہیں اور نہ
وہ ان سے الگ ہے۔ اسی باوث یعنی نظموں انہیں سطح پر قاری کی
آواز معلوم ہوتی ہیں اور ان کا اخلاقی رنگ ان کی ان کی کشش
کو کم نہیں کرتا۔ جو ان کے عینہ اشان کا ہاتھ تاریخ کے ہاتھ
میں ہے اس لیے انھیں اخڑا یا اخڑا کی طرح کے لیے کا حس
نہیں۔ زینا یا دُنیا، ایک روپ میں شفیق ماں کی طرح ہے۔

اس کی گردی میں ایک بچہ تھک رہا ہے وہ اپنی چھاتی کو
کھولتا ہے اور اپنے بچے کے سر کے ہوشیوں کو اپنے
لہو کے دس سے بھکھرنا ہے۔

(دُنیا)

لیکن اس کا دوسرا درپ بھی اسی وقت نہیں رہے فرق امر
زاویہ النظر کا ہے۔ اس کے ناخنوں
میں نکیلے شتر لگے ہوئے ہیں وہ اپنے بچے کے پیٹ
کو چیرتی ہے۔

(دُنیا)

یہاں مقامی کا شیر یاد آتا ہے۔

از محلہ دلِ طفلانِ لاگونِ رخ کا میزد

ایسی زالِ سفیدیا بروائیں اُم سیہ پستان

عزیز قسی کے یہاں دلکش شاید کسی کے یہاں بھی، ”اُم سیہ
پستان“ کے بھیاں لکپن اچھا بہتیں میں سلتا۔ لیکن عزیز قسی کا
دوبلے VISION اپنی جگہ پر الگ چیز ہے۔ جس جگہ وہ
دوبلے VISION نہ ہے وہ شہر کا مقام ہے:

سیدی
تزادہ خوبیں بلکہ انہیں وقت اور جدوجہد میں اور لقین کے بارے
بیویت۔ اور ما تھامس کی علامت ہیں۔

اخڑا یا یان لئے وقت کو زوال اور تبدیلی حلل کی علامت کے
طور پر استعمال کیا ہے۔ اور سپر خود وقت کے لیے کئی علامتیں اور
استعارے بہترے ہیں۔ اخڑا یا یان کی نظموں میں ہم لیے انسان سے
روچاہ ہم تھریں جو زوال اور تبدیلی حلل کے ساتھ بے دست دیا ہے
وہ خداوند خود مٹا سکی کے قدر لیے اپنی حالت کا معاواد بلکہ اس کے
ساتھ معاواد (کہنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخڑا یا یان کی
نظموں میں ہم اکڑا بی شیہ نظر آتی ہے۔ یہ شبیہ ہم خوش ہوئیں کتنی
لیکن ہم خود کو دھولا دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہم نہیں ہیں۔

جب تو میرے پیٹ میں تھامیں نہ ایک سپنا دیکھا تھا
گدیں اپنی سانپ لیے بیٹھی ہوئی تیری عمر بڑی بڑی ہے۔
لوگ بخت کر کے بھی تھوڑے ڈر تے رہیں گے
میری ماں اب ڈھیروں من بھی کھرنے سوئا ہے۔

سانپ سے میں بے حد خالف ہوں
ماں کی باندھ ہے مگر اکر میں نے اپنا سارا نہ راگل ٹالا ہے
لیکن جب سے سب کو معلوم ہوا ہے میرے اندر کوئی نہیں
اکڑا لوگ بھے احمد کہتے ہیں۔

(تعلیل)

لیکن کب سے لب ساکت ہیں دل کی ہنگامہ آرائی کی
رسوی سے آواز نہیں آئی اندھاں مرگِ مسلسل پر
ان کا یا آنکھوں سے اک قطرہ آنسو بھی تو نہیں پہلا
(تفاق)

عزیز قسی کے یہاں وقت سے زیادہ دُنیا کا احساس ہے۔ ان کی
حضوریت عورت نظموں ”بچل پائی“ اور ڈائی میں دُنیا اور دنیا داری کو
ذوقِ البشر بھیجا نک اور مکمل نہ ہستیوں کی علامت کے دریغے ظاہر

ایک حصہ ایسا ہے جو اپنی بھی باقی ہے۔ یعنی خود بینا دی طور پر
تو اس کی شاعری ہے اور اس کا تسلسل ایسا شخص ہے جو حالت
میں OUTSIDER ہے اور تھا ہے۔ عزیز قیسی کی غزل میں تسلسل
رومانی طور پر بھی OUTSIDER ہے اور جسمانی طور پر بھی۔ ان کے
یہاں اس بات کا شدید احساس ہے کہ شہری زندگی میں گفتار
بہت سے لوگ ایسے ہیں جو شہر والے نہیں ہیں، باہر کے لوگ ہیں۔
اندھا لوگوں کا المیہ ہے کہ انہیں موت بھی اپنے گھر میں نصیب
نہ ہونے۔

پھر جس طرح بنا پڑتے
دوسرے کے ٹھکانوں کے ہالوں کو سب کھول لیتے ہیں۔
اور جس قدر بن پڑتے
اپنی جسموں کو بھر کر
ٹھکانوں پر اپنے پڑتے ہیں۔ اور جب دیکھتے ہیں
مال و اساباب محفوظ و مقصود ہے۔
آل و اولاد امروں و مکھوں ہے
عورتیں پاک و مستور ہیں

پھر جس طرح بنا پڑتے
دوسرے کے ٹھکانوں کے ہالوں کو سب کھول لیتے ہیں۔
اور جس قدر بن پڑتے
اپنی جسموں کو بھر کر
ٹھکانوں پر اپنے پڑتے ہیں۔ اور جب دیکھتے ہیں
مال و اساباب محفوظ و مقصود ہے۔
آل و اولاد امروں و مکھوں ہے
عورتیں پاک و مستور ہیں

شکر کرتے ہیں اپنے خداوں کا۔ اور یہ دعا مانگتے ہیں
کہ یوں ہی سدا ساتھ یہاں وابستہ کے سلامت رہیں
(شہر خدا تسان)

آخر الارضان کی نظر "شیشے کا آدمی" کا اس نظر سے تقابل خال
از بھی نہ ہو گا۔ لیکن اس میں کوئی شکنہ نہیں کہ دلخہر خدا تسان
اس بھی سے (گردیار) کی کامیاب ترین نظم ہے۔

باتیں بھل جا رہی ہے اور ابھی عزیز قیسی کی غزوں
پر انہما پہنچاں باتی ہے۔ تفصیل کا متعدد ابھیں رہا۔ لیکن چند
ہاتھیں کہنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ غزل کی قدیم شریعت کا طرا
حتہ الگریہ منہدم ہو چکہ ہے لیکن اس کے آثار باقی ہیں۔ اور اسکی

فٹ پا تھوڑے جو لاش پڑی ہے اسی کی ہے
جس کاؤں کو یقین تھا کہ روزی رسالہ شہر
جنگل کی رات ہو گئی آبادیوں کی رات
ہیں کنج کنج خوف زدہ جا گئے ہوئے
مجبوب شہر ہے لگھ بھی ہے راستوں کی طرح
کسے نصیب ہے راقوں کو جھپکے رضاہی
غزال کی دنیا میں زندگی تو بدلتی نہیں ہے لیکن زندگی کو دیکھنے
والا کبھی کبھی بدل جاتا ہے۔ رہتا ہر حال وہ ایسا شخص ہے جسے زندگی
قبلہ کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے
قاچین خود وضع کرتا ہے اور اس کی زندگی کا فصل عام معیاروں سے
نہیں ہوتا۔ عزیز قیسی نے اپنی کتاب کا نام خواجہ شیراز کے شعر
کو بنایا ہے۔

دریں صورائے غم جوں گرد بادم
ہلیشیبے قرارے خاکارے
میں تیر کا شرسنا کا اپ سے رخصت ہوتا ہے۔
نشود تا ہے اپنی جوں گرد بادل کھی نہ بالید خاک ہرہے ہے ری تھیر ہمارا
میرا خاں ہے حافظ کے گرد بادسے زیادہ تیر کا گرد بادل قیسی کو پکارتا ہے۔
بندھا ہے رخت سفر بخوب رہے دل کا اللاؤ
عزیز قیسی کو بھرے پیام سیلی دے ۰۰

عزمتی

شبِ نوم — سحر آہن

اس داستے والوں میں سے کام لگتے۔ گیاتر اس نہ بدلنے پر
اپنے کام تھا۔ اس نے اس بیان کرنے والوں میں جماعت
کے خواص پر چلا۔ بلکہ اپنے بولائے ہے۔ باسوس کے اور بہت سخت تھے
اس نے اس کام کا احتساب پلت کر دیکھا۔ اس باقاعدے پر
کافی خود کیے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں اس پر خدا کو اور حسین نہیں تھا
”قتنے کئے مکون کیے باسو۔“
”چا۔“ باسوس گریٹ زمین پر ملتے ہوئے بولا پڑتے کہون۔
کام جماٹ کے تین برس کے بعد بجا رکھا تھا پیغمبر نبی مسیح
و قصیدہ لوگوں کی کشیدگی سے ہی بجا رکھا یا کیا۔ کوئی کھوئی
کھوئی کرنے کیلئے بیس بیس کو کھلایا اور جتنے کھون کا فوج جاؤ۔
تینی برس جو کئے اب تک پیس کو کہتے تھیں لیکن پیس کا حصہ
فاروج ملتا ہے اپنے کو ”رج محل“ سے پہنچتا ہے۔ باسوس
خانل سے تیرا بھی رکیا نہیں یا باسوس پیس، نشپرخ کا ناق
یاد کر کے ہلکی سی ہنسی مہنا اور پھر رادھل کا پر کیا۔ پھر اسی پر
لیلا درد ہیرے دھیرے بدلنا ہے جو سے بلکہ اسی پر

”میں اُخڑی بار لوچہ روک تیرے سے۔ پیاری بیتا کیا نہیں۔“
باسو نے ۵۵ کا پیکٹ اس کے آگے بڑھایا۔ مکل کورٹ میں اُس کو
کی بخشی ہے۔ سالجیں سے سائش دیئے گئے اُس کا اس کو مکھوس کرنے کا۔
بلکہ کرتا ہے اپنا کام ایسا کہے پیاری؟“ اس بیچ میں باسو نے سگریٹ
جلدیا تھا۔ اپنے دل میں سگریٹ کا ایک لہاکش لیتے ہوئے اس نے سوچا۔
سماکشی دینے والے سے اس کی کوئی دشمن نہیں ہے۔ وہ تو اسے جانتے
ہیں۔ مگر سگریٹ کے بف اپنے تھار دا بھی ابھی کھائے ہوئے ہے
بساٹ کی چانے میں بھی ذکار کے ساتھ دھوال چھوڑتے ہوئے اس نے
باسوس سے پوچھا۔

”زکمریہ کام کیوں نہیں کرتا۔ میں تو کامگار ہوں۔ توپن دار آئے
باسو۔“ میں نے کبھی مکون نہیں کیا۔ باسو اس کے سمجھانے کے انداز میں بولا
”تیرے کو اگلی نہیں ہے کیا۔ میں نام صیغہ دادا ہوں لکھا۔ میرے کو سب
چھوڑنے ہے۔ پیس پیس سب کے لئے میرے کو چھوڑنے کے میں۔
سیچھو لوگ اس لیے بولا ہے کسی بگیر نام تریں اور می سے یہ کام یو تو
اس کا بھی جھلا ہو دے اور اپنا کام بھی نکلے کیا۔ قانپا یا اسے پڑانا

سلہ۔ عنوان شیفت کے اس شعر سے یا گیو یا لوگ بھی غصب ہیں کہ دلیرت انتیار شبِ نوم کیا سو آہنی بیان
سلہ۔ بیماری لیکا ہیں۔

سلہ۔ مجھے مغل نہیں ہے کیا۔ نیز الشور دادا ہوں۔

جول ۱۹۹۱ء

۱۵

کھنڈہ بی بی دل سے وہ نگاہِ گوم رہتے ہے۔ اس کی پڑوں زینب اس کی مانگوں کے بیچ میں تھام کر کہتی ہے۔

”کوئی جائے گا بنی؟“

زینب بہت بے شرم ہے۔ مگر مجھے بچتے کیا شرم زینب تو بُدھی ہے۔ وہ خود ہی زینب کی طرف سے سوچنے لگا زینب کی چھٹیاں ہیں۔ سب سے بڑی کو اٹھا رہ برس ہوتے اس کا باپ لے کر چلا گیا۔ دوسرا عورت کے پاس باسو نہ پھر ٹوکا دکھدھے سے سلے تو ہے۔ وہ سچ پچ آب کم اپنے بچتے کے پاس تھا۔ زینب جس کے ساتھ کا ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے اُس کے بچتے پر مجھ رہی تھی ”بڑی میرے سے شاخ کرے گا“ اور بھراں کی مانگوں کے بیچ باتھا ہے اور بڑی یا اپنے ساتھ اپنا جھوٹا سا ہاتھ رکھ کر بھاگ جاتا ہے اور بھاگ کے پانی مال سے پیٹ جاتا ہے۔ ”میں تو اُن سے شاری کر دیکھا گا۔ تیرے سے کب بی نیئں کر دیں گا“.....

”بول“ باسو نے بھوکا دیا۔ بول پسیاری لیتا کیا نہیں؟ تیرے کو بھی نہیں ہونے کا۔ میں ہوں ناتیرے پر بھیچے سیٹھوں ہے۔ سمجھ کجھی پر اسیں بلس سب ہے تیرے کو بچانے“ وہ چپ چاپ سنارہ۔ باسو کو ایسے لگا جیسے وہ ان کیا ہوئے یہ رکھتے“ باسو نے ایک رامپوری چاقو اس کی طرف ٹھیکایا۔ اس نے چاٹو نہیں لیا وہ چپ چاپ چاٹو کو دریختا رہا۔ باسو نے اسے بھایا۔ ”جب وہ کتنا ساکشی دیتے کو جھوٹے میں ہوڑا نکلیا۔ تو ایک کھاک سے کٹا نڈر کر کے ایسا گھادا رہ۔ باسو نے چاٹو کو گھوپنے اور اس کو پیٹ میں گھما نے کا ایکش کر کے رکھا یا در کھلاس“ ایک ہجد جو نے تراپ بھاڑیا ہوں باسو نے جیب سے نورٹ نکالنے کا ایکش کیا۔ باکی دس ہجھار تیری عورت کو بھوپنے جا ہنگا۔ کام کے بعد۔ کسر سے ہم لوگ جہاں کے بہت بچتے ہیں

”بھر جاؤ گی میں نے کا نٹا گھا یا تھا وہ رات میں کدر میں گیا۔ سیریا صافی لگا گھوں میں گیا۔ گھوں کر لئے کہ پہٹ۔ وہ رات میں سو نے سانول کے ساتھ گناہی تھی۔ سانول نے اس کے خون میں بھرے ثرش کر جو کر جائے بھائی تھی اور بھر جائے کے ساتھ کلک پاؤ کھل کے بدل۔ باسو۔ اند۔ گا۔ بے دیچانی کے گاؤں کا اٹھ کے کتوں کے ساتھ ٹال روپی گی تیرے کو“

ہل کی قسم کھا کے ہا سو فٹے سے پیٹلیا تھا۔ باسو بڑے مکھاناندہ میں بدل۔

ایسا ناٹ کیا سلی کوکن کھس ہو گئی کیا۔ اسے اور دی جات کیا ملکتی ہے بس اچھا کھلا کے اس کو۔ باسو ادنہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ وہ سُن نہیں رہا تھا۔ عورت ذات کیا نگتی ہے وہ سوچ رہا تھا اس کی جیوی تو کچھ نہیں ملکتی۔ وہ اپنے پیٹے پر نہیں مانگتی۔ وہ تو گفتی سے بھی اپنے پیٹ کے پیٹے پنچھے کے پیٹے مانگتی ہے۔

کیا سچ رہا ہے؟ باسو نے بھوکا در نہیں سالے۔ کدر اور ہے کیا۔ تیرا بھی کیا کرنی اورت سے لفڑا ہے؟

”ہاں ہے“

”کس سے“

”اپنی عورت سے“

باسو اُنی زور سے ہٹا کر جائے کی جیکی اس کے مذہ سے اچھل کر اس کے ثرش پر حصیل کئی۔

”وہ رات کھون جسیں اپسارچ بھر گیا تھا صالہ فارن کا شٹ تھا فس کلاس لال پلچھوں کا۔ سانول نے جلا دیا اُس سے“ باسو کو سانول اپنے تک پا دا کر کیا تھی اور اس سے اس کا چار سال کا بنتا۔ باڑیا۔ یاد آیا۔

سلہ۔ میں نے جواب کیا تو مارا تھا اس رات میں اور کبھی نہیں گیا سیدھا سانول کے کمرے میں گیا خون کرنے کے بعد۔ سالے تو اس وقت کیا گر ہے۔

کر لے چکا اور بہت کڑا کہے۔ مٹا وہ سوچ دیا تھا۔ ”وہ جو گلے گلے
کو گلے گلے ہو گئے ہیں اسے دیکھ لے تو اُنہوں نے اُنہوں کے پاس پہنچا
فائدے کے لئے کوئی کلمہ کرنے کا پیارا نہیں ہے۔

”بہت شکریہ بالعبت ہے بالائیں اُنہوں کے پاس پہنچا۔ اُنہوں کے پاس
ہم گلے گلے ہو گئے۔ بیرون کو چھوٹا ہو گیا ہے۔ جو سوچ دیکھا تھا اُنہوں
کے آنس سکریوں کے اپنا مکان انہیں بھی راجہ دادا اور اُنہوں کے قوت ہی تھے۔
وہ اس کے تصور میں راجہ دادا کا مکان اُبیرا۔ مانا کو اُبیری بھی بہت احتیاط ہے
اس پر بھی خون کا کندہ رکھنے نہیں ہے۔ اس نے سوچا وہ فاما کے باستے
یہ سوچ رہا تھا اس آنس سکریوں کے بھی سے باقی کرنا تھا۔

یہ اپنے دیکھا خوبی کا ادھی ہے۔ آنس سکریوں کو دیکھتے تھے
وہ کرس کا پارچہ کرتا ہے جو بھی تیسرا کا نہیں تھا۔ اُنکوں جس اجر کے لئے
بھی دیکھا جائیا جائے اور کس کو اُنکے سکریوں کا انتہا ہے جو بھی ہے۔
اس نے سوچا آنس سکریوں کے پرچار پر کچھ قدر مل سکتا ہے، پھر وہ
ای اپنی سوچ پر خوش ہوا۔ یوں ہیں کے پاس پیسے کمال سے مزدود ہے
جیسیں ہر ہمارا کو اسکی ہے ان کی اٹھیں مخالکت ہے۔ پیسے نہیں دے سکتے۔
.... اس نے سوچ پیسے کے ساتھ گپتی ہی سے سوچے اٹھکے جائیا تھا۔

گپتی ہی کی لگوں سرکل پر کپڑے کی دکان ہے۔ وہ سوچ پیسے کی وجہ پر
مشائق بھی دے دیتے تھے۔ جب وہ کوچ بھی ترکیبیں کان کھلکھل
ساختیں بابا کی تھوڑی کو روپ سے رہے تھا اس نے جب پیسے مالک گئے تو
گپتی ہی اسان بابا کو روپ دیتے کے بعد بھی نہیں سے بیٹے:

”وہیں کہاں کرو گے؟“

”ہم کھلتے ہی دیکھ دیں گے؟“

”ہم کبھی نہیں کھلے گے۔“ اپنے اپرے دشمنوں سے بے پھر اُسے
بھکلنے لگا۔ ”وہیں کیسے ہیں کھلے گے۔“ کھلے ہیں سمجھ دیا تھا۔

سب میں کیا؟“ دشمن جو اسے قرار دی رکھنے کے لئے ہے اور جتنا بڑے گا
لیکن شیخ ووگ کہتا ہے این گاہ کیا ہے؟

اس نے دھرم سے کہا۔ باسو۔ سہنپڑے یہ چاکر یہ چار بھی
رہنے والے میں تیرے کو کل بتاتا ہے میں پر اس نے خصوصی انداز
میں کہا اور سکھ گا۔ باسو پھر اُسے تسلی دی۔ ”ماں کی کسم۔ کچھ نہیں
ہر ان گاہ تیرے کو۔“ چھہ جیسے تو اندر بھی ہر ان گاہ میں تیری ہفت کو
تیرے پر ٹکرائیں گا۔ ... اس نے پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ
میں لیا۔ باس کا ہاتھ سخت تھا۔ اس پر کوئی خون کا ہٹھ نہیں تھا۔

اُس کی کچھ سمجھ دیں ہیں آیا تھا وہ کیا کے۔ پو سے (۱۹) ہیئت دی
اس کی بیل میں ہر ہمارا پیسے کی خلی اور اس سارے مزدود ہتھ کو لے تھا
وہ یوں ہی یوں سکھا فسی ہیں چلا گیا۔ اس کے کئی ساتھی گم ہم بیٹھے رہتے
اوی آنس سکریوں“ جویں رازداری سے کسی اجنبی سے بات کر رہا تھا اور
اجنبی کا فذر پر کچھ لکھتا جاتا تھا۔

”کچھ ساچا ہے کیا؟“ اس نے پیچہ آنس سکریوں نے اسے بڑے
غور سے دیکھا اور بولا۔

راجہ دادا سیٹھوں لوگ سے بات جیت کے لیے گئے ہیں کچھ مل مند
ہو سکتا۔ دراجہ دارا وہ شریڈنین پسپور کو بولتے ہیں، ”کدر“
”وہ بڑا ہو ٹوٹے ناکلابے پر۔“ دہاں کے درکاری اپنی یوں ہی میں
ہیں اور ہر سرکاری افسر بھی آئے ولے ہیں، ”روز پریس“ ولے یہی خبریں
چھاپتے رہتے ہیں کہ میخت اور درکار سے بیع سمجھوڑہ ہونے والے ہے نہ
کسی نایو اسٹار ہو ٹوٹے ہیں سرکاری افسر بھی بات چیت میں خریک ہوتے ہیں
اور راجہ دادا سیٹھوں اور سرکاری افسروں کے ساتھ بھی پیچ کھاتا ہے کبھی ذر
کھلتا ہے راجہ دادا مزدوروں کی مانگوں کو منوا کے رہتے گا۔ بہت کام

لے۔ توجہنا مال برے گا سیٹھوں ووگ دے دیں گے۔

۱۹۹۱ء۔ جولائی

۱۶

سارے ہی پارکی بھی زیج ہو گئے ہیں جماں صاحب۔ ہم بھی از ار بند کرنے والے ہیں لگتے سپر کو.....

و گپتا جی کی دکان سے نکل آیا۔ افس سحر طریق بھی کب بڑے جوش میں اخبار دالے کو تباہ کرنا۔ دادا کو گھوس دینے لگے سیٹھوں کو۔ دادا بلایک پیسے بھی گھوس نہ کرو تو دکور لوگوں کا خدن پیچے گا۔ دادا بہت پکھتے ہیں۔ اس لیے ہمارا سانگھری بھی پکھاتے۔ دارانے ہر کامگار کو فولاد کا گھنکا بنایا رہتے ہیں۔ اس کی نظریں خد بخود اپنے ہاتھ پر گئیں۔ اور اس نے ہاتھیاں بند کیں ہاتھ پر خون کا کوئی دھنپہ نہیں تھا۔

وہ چپ چاپ اٹھ کر افس سے باہر نکل آیا۔

افس سے نکل کر وہ گھوستارہ۔ ابھی شام نہیں ہوتی تھی۔ دادا سے ماہم تک دیل کی پریلوں پر جلتا رہا۔ پہلی رہا مدد و دین میں بھی اپنے دوڑی۔ قتل میں چڑپے بالوں کو پتھرے کھینچ کر گذلوں پر گناہکیں بدلنے یا ایک چٹی نجومیں اپنے لہرائی لاکوں میں پیڑی اشیل یا پیٹل کی پالیں اور نتھنیاں جھکاتی آتے جلتے لوگوں کو پھیر دیتی تھیں۔

”سیٹھوں جیجنگا کیا؟“ ایک نے آنکھا کر کر پوچھ دے مکار دیا۔

اپنے ہاتھ کا انگوٹھا کھڑا کر کے ہلا دیا کہ ماں نہیں ہے۔ دوسرا ہوت جو ایک ہاتھ سپاٹی مانگوں کے بیچ ساڑی پکٹے ہوتے تھی اور دوسرے ہاتھ سے بلغزا اور ساڑی کے درمیان کا حصہ کھواری تھی۔ بڑی محبت سے بولی ”مرد کو انسیں تو فاندہ نہیں لیتے۔ اُنھار چلے گا چس۔“

”اُنھار“ ایس نے حیرت سے پوچھا

عورت بولی ”گلاں دیکھ کے اسحار دیتا ہے۔ تو ادھر ہماری

میں رہتے ہیں؟ میں تیرے کو تھیاں چلے“

”بچر کبھی۔ کبھی کوہ آئے بڑھ گی۔“

سلہ۔ نقدر تم نہیں تو کوئی بات نہیں۔

ملہ۔ کاکہ لحدیہ را دیتا ہے تو پسند مکہ را۔ رہتے۔ میں بچھے چھاتی ہو۔

”مگر ناقول بند ہونے میں ہوتا ہے گپتا جی۔ اس نے اپنے نیڈر کے لفڑ دھیرتے ہے جبکہ زندگی میں کرتا ہے تو اس کا قایق بندگا کا پیسہ جاتا ہے۔ پس سیٹھوں کا دکوں کا گھنٹا ہوتا ہے۔“ ”تم کو جو تمہارے لیے ڈسکھلاتے ہیں سبھی لیتے ہو۔ اس سے جماں۔ میری ہات دھیان سے سفر۔ یو جو ہے نا تمہارے یہ بیماری ہے جسے جیسا ہے جیسا کوئی گول کو سلا کا پندرہ لاکھ کا گھنٹا ہے۔ اور جو سندھی ہے تھرف دیلوں لکھ کا یا اس کی سمجھ میں کبھی نہیں کیا۔ اور گپتا جی بھلے تھے ہے۔ میں مالک خود نہیں چاہیے تکہ ہر تال قدم ہے۔ یہ بڑے کھدا غوث نے کرانے ہے۔“ ”و گپتا جی پتہ نہیں کیا اٹھی باتیں کر رہے ہیں۔ ہر تال قدم ڈکھانے کی ہے۔ ہمارے دارانے کر والی بندے کو سوچ رہا تھا۔ اور گپتا جی نے کہا تمہارا لیجہ مارا سیٹھوں کوں سے ہلگیا ہے۔“ سمجھتے جا رہے تھے میں الحکم کا نقشان ہوتا تو وہ ہر تال ختم کرائی۔“ ”دیکھو گپتا جی، اپنی دکان میں سکھ گھر دل کے تھرد کھانے لگے سیٹھوں کا جا شک مڑرا ہتھاں بگ رہا ہے۔ اور ہر کٹھے والوں کا دھنڈ دیے کھاچل رہا ہے۔“ گپتا جی نے سوال کیا ”دلوں پل رہا ہے یا نہیں؟“

”بھڑان از سے دیکھ لے گپتا جی۔ پن سرکار قور کر لوگوں کی پیچ کرے گی نا۔“ ملکار قوشش رکھتے ہے تاہم گپتا جی بڑی زور سے ہے۔“ اسی پیسے تو سرکار از سیٹھوں سے لکھنی کافی نا۔“ مگر رہی ہے۔“

”پتہ نہیں گپتا جی آپ کیا بول رہے ہو؟“ اس نے بہت سوچ سوچ کر لی۔ داشت ہیں تیس ذہن، شتعل کی دیگرے کو سعد دیپے بدل دی۔ مہربان۔ حورت کو بچے کو کاڈن بھی نہیں لے۔ بیاچ لے لیو۔ میں کھلتے ہی ڈبل دیے یوگا۔“ وہ گلاں کر رہا ہے، گپتا جی سکرتے ”کاؤں میں تیری حورت کیا کھلتے گی؟“

”اُدھر پہنچنے کو گپتا جی۔ کچھ تو بھی کھائے گی؟“

”د۔ تو بھی جو چاہا گا۔ میں نہیں کھلنے والی۔“

جس گپتا جی نے اس کی طرف تو جو نہیں دی۔ گلاں دیتا رہے۔ سرکار کی خواہ پسند۔ اس ہورت پیسی بُر کا ہے۔ اپنے دیس میں کیا نہیں بنتا۔ جس پیسے پسند کر رہا ہے کے پیچھے کھلتے ہیں۔

مدتو کی بیٹھنے کا سے گا.... عجالت نے خاتمت سے گالی دی۔

آگے لال پلیے رنگ کے پکڑے پہنچنے ہوئے۔ گالیوں پالیوں اور
خشنیوں کا میلان تھا۔

”کس سے“

بینب سے۔ بچہ نب سال پانچ سالہ حرم کو گالیوں
دیتے ہے سب سارے ہے گنتی بتا سے بہام یہم ہوتے ہے۔ سالانہ نہیں
نہیں آتی تو کل حمار کامیں جا کر رہ۔ تیرے پاپ کا سر وہ مکار
ٹلیٹ جا۔ ملک میں جا۔ ادھیر کا شکر ہتھ ہے۔۔۔ اسکے لئے
۔۔۔ سال بولتے ہے اپنا گنتی بتا کہ محی نہیں ہے۔ بیتلہ ہے مٹھے
گنتی بتا سیا اس کرے گا اس کو۔۔۔

وہ ایسے پلہ رہتی ہی جیسے زینب سانچہ کھڑی شرمنگی ہے۔
اس کی ہیئت خاموش رہنے والی بیوی بہت بیل رہتی ہے اس نے
دیرے سے کہا۔ بچہ نب کا بیان احترم نہیں ہادم ہے کیونکہ تعالیٰ
برقا تھام فرگ بھی تو اکھا عمرہ یہ ما بعد مکرتا چھاؤ دا بہار اس
وس دن ملا سلماں لوگ دھان کتا۔۔۔ وہ کیا ہے۔۔۔

”بولا“ اس کی بیوی نے کہد ”بن سال گتھے کتی“

”نیٹ بچہ نب ایسی نیٹ ہے۔ دیکھو ہمگڑا اور ڈا انہیں کرنے کا
وہ دی ہید کو سمجھ۔ نہ باڑا کو شیویاں کھو دیا کیا نہیں۔۔۔“

”تو کیا ہذا۔ میں اس کی پول کو کیا کیا دیتی تھی کھلنے کو۔ پوہا
وڑکر تیکھ فلانے۔۔۔“

پہنچا کہاں سے آیا۔ اپنے پاس تو۔ جھر کھنے کو طریقہ تھا۔
”انعام لائی بنیاے“

”بنیا دھار دیا۔۔۔ اس نے حیرت صور پہنچا۔۔۔

کہیں سے گئی کی وندنا سانان دے رہی تھی۔ وہ گندے خیالات
ذہن سے جھٹک کر اُنھر جلی۔۔۔ گئی کی اُنار قی آماں جا رہی تھی۔ وہ دعا کھڑا
آٹھیں بند کیجے پڑا تھنا کرتا رہا۔۔۔ گنتی بتاں کھلا دے۔۔۔

یہ پار تھنا نہ جانے کتنی بار وہ منہ میں دبرا آتا رہا۔۔۔ وندنا جعل
رہی تھی۔۔۔ اگلے برس تو جلدی آ۔۔۔ پن جا دش کو پچھلے برہ بھی اس نے
پار تھنا کی تھی۔ ایسی ہی لیکن گنتی بتا کو چڑھا دا انہیں پڑھا سکا، اعنی
اپنے شرط نکل جیب میں اچھا ڈالا۔ جیب بھٹی ہوئی تھی۔ اس کی کنڑی
پر ایک سخت باخہ کیا ہے باسو تھا۔

”دیں بھی گنتی بتا سے کچھ مانگنے کیا یا تھا۔۔۔ باس بولا۔۔۔
وہ کیا“ اس نے پوچھا۔

”بولے گانہن۔ باسہن۔۔۔ کل دقاکے ہوٹل میں آجائے۔۔۔ کی
میں تیرے کو فس کلاس نامہ کراں تھکلکیا۔ اور تیرے کیا یک جگہ تکسی میں
لے جائیگا۔ تانپا یا سہے کیا۔۔۔ کل ساکھی کو تو کھلاس کرنے کا سپاری
لینا، اس نے بھرا اس کا ہاتھ دیا۔ ہاتھ سخت تھا۔ اس پر کس خون کا دھر
نہیں تھا۔

اس کی بیوی نے پوچھتے نہیں کس سے مانگا تھا۔ گرم گرم پرہ
تھا۔۔۔ ہستے دہٹے پیار سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتا۔ اس
کا بچہ جس کی ناک سے رنگتھ بہر رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے ناک صاف
کر رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے پوچھا کھارہ تھا اور پرستہ نہیں اس سے
کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے کچھ نہیں مٹا اس نے دیکھا اس کی بیوی کے مانچ پر
خاشیں ہیں لیکر دل جیسی بیوی جیسیں اکثر میں اس کے مانچ پر اجاتی
تمیں اس کی بیوی کے لوبے کے کڑے سے اس کے اٹھپر، ندھما

ملہ: شود رابرہ

ملہ: زینب کا پانچ سالہ حرم ہیں علم ہے۔ جسے کہنا چاہیے تھام فرگ بھی
سالوں سر بیلت ہو اور ہم کے دس یہ دو دو اعماں کی ہنگامہ کرنے ہیں
ملہ: سوتیاں۔

کھوں۔ ایک کھون بہرے آواز جی بھی ریلی نی سیوں۔ کتوں کے جھونکنے کے خود مادہ سخنیوں کی بھیں بختا ہٹھیں ڈوب گئیں۔ اونچے جانے کب وہ سو گیا۔

اس نے خواب دیکھا کہ وہ مل کے پچھا ٹک کے پاس کھڑا دیکھ رہا ہے۔ مل کے سامنے کی گی۔ لگی نہیں ہے ایک میدان بن گئی ہے۔ بہت بڑا میدان دو رکھیں لا ہوں لوگ ہمیں لیکن اس کی نظر دنکے سامنے جو تسمیہ پر اس کی اپنی لاش پڑی ہے۔ خون میں توت پت لاش کے نزدیک کوئی نہیں ہے اور ایک طرف لاش سے منہ بھرے اس کی بیوی زینب کے ساتھ کھڑی ہے اور اس کا بچہ۔ دادا کے ساتھ کہیں جا رہا ہے سب لال پیلے کپڑے پیہٹہ ہوئے ہیں جیکے کہا تیو ہار ہو۔ ”میری ارتحی اٹھائے والوں کوئی نہیں ہے۔ میں پاپی جو دہ جلتا ہے اور دھاڑیں مار رکر رونتے رکھتا ہے۔

اس کی بیوی کا نئے اُسے جنہوں کو جھگایا۔ اس کی آنکھیں... آنکھوں سے تھیں۔ خواب میں وہ بہت رویا تھا۔

”لیا ہوا۔ کائے کو روہا تھا“، اس کی بیوی گھبرا کر پچھر ہی تھی۔ کڑا سے تیل کا دیاز جانے کب کا بجھ بچکا تھا اس نے بیوی کو پٹپٹا ہوا اور پھر نئے لگا ”میں نے مجھے مارا۔ مجھے مارا“ وہ روہا تھا اور اسے چوم رہا تھا۔ میں پاپی ہوں پاپی ہوں“ وہ اب بھی سوہما تھا اور اسے چوم رہا تھا۔ بیوی کھل کھلا کر منہ دی ماں اس لے بیوی کے دوفنی باخھنے اپنے گاہ پیشے اور پھر پھوٹ پھوٹ کر روپڑا۔ بیوی نے اُسے اپنے سینے میں چھپا لیا اور اس کے بالوں میں بڑے پیار سے با تھ بھر تھے ہوئے بولی ”بچپن ہے تو... اور انہیں ہر یہ شفیں چڑا۔ جیسے اس کا بچہ بارڈیا ہنس پڑتا ہے۔ پھر اس کی بیوی کی نہ اس کا سیز سہلا یا اور دھیرے دھیرے اس کا شرٹ آتا نہ لگی۔ شرٹ آتا نہ میں بھٹک گیا۔ دل گھرا گئی۔

”دیوا۔ پچھٹ گئی شستی؟“

”دیتا میرے کوئی کوئی اگر اک کو جھوپان کے.... اس کی بیوی کا لکھرہ پر را بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک زور دار طانپہ اس نے جھوپا۔ اُسے پھر ارنے کے لئے اتحاد خاتا یا تو باڑیا رو نے لگا۔ پھر اس کی بیوی نے زور سے چلنا شروع کیا۔

”صلاد حرامی۔ دوڑی دینے کو نہیں۔ مارتا ہے۔ تو میں گا۔ بس کہ نہیں آکے۔ میرے کو ماتنا ہے سلام حرامی کی اولاد...“ وہ چلارہ بھی زینب دھیرے کی اس کی بیوی کو تھبیٹ کر لے گئی وہ بیوی اٹھا اور باہر بچلا گی۔

رات ہو گئی تھی۔ کئی مہینوں سے وہ بناوار پر یہ کبھی ملبی کبھی دیہ سے گھر آتا تھا۔ آج بھی اس نے دار دنہیں پا تھی۔ لیکن روزنکی طرح اس کی طبیعت میں چوپڑا پن خیس تھا اس نے دیکھا اس کی بیوی بچی کے پیٹ میں لے ٹاگیں اسکے سر ہی بے اور اس کے آنے پر جاگنی نہیں لیکن اُسے فحش نہیں آیا۔ شام سے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ اس کے اندر کچھ بچپن رہا تھا۔ بروم کی طرح۔ اس نے کچن سے در دانستہ تک بھیل ہوئی تھا۔ جادر اتاری۔ ڈوری پر پڑی اس کی بیوی کی ساری اور بھین کے ساتھ ڈوری ثبوت کر گئی۔ چلنی اس کی بیوی کے سر پر کوئی بھر بھی وہ جاگی نہیں۔ لیکن اُسے بیوی کا پابھی غصہ نہیں آیا۔ اس نے بیٹھتے ہیں کے فرذ پر چارہ بچھانی اور طبیعت گیارہ دن کی طرح۔ یہی اسکی پنگ تھا۔ دیکھیں سے آواز آرہی تھی۔ گینتوں تک موریا۔ بن چاٹنکی توکریا۔ اور اس شور میں کہیں رہیں کی سیٹھی تھی اکھیں کتوں کے جھونکنے کی آواز اور ان پر چھانی ہوئی سارے شہر کی خاموشی جن بختاری تھی جیسے پاس میں لاکھوں شہد کی مکھیاں اور ہیوں اور اس کے کافل میں یا مومن سرگوشی کر رہا تھا۔ بس ایک کھون کر لے۔ ایک کھون کر لے ہڑتیں نہیں کھتم ہو گئی۔ مل نہیں کھد گئی۔ گپتا کا آواز آرہی تھی۔ یہ، ایک کھون کر لے بھر پیسے ہی پیسے تری جوست پچھے کو بیسے ملے گا۔ بس ایک

سب دری
لکھا بات نہیں" اس نے سرگوشی میں۔ وہ نیکا ہو جیکا تھا اسی مندرجہ
اُسے اپنے دھر سے مٹول کر محسوس کیا تھا..... پھر وہ امیر سے
لپٹ کر سو گیا۔

اور خوش خلقی سے رہیری اور مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔
انی گران بار معرفہ فیض کے باوجود ایک ایسی اہم تحقیقی کتب
کا معرفی وجود میں آنا سمجھے سے کم نہیں۔

یہ تالیف جن مفہایں پر مشتمل ہے وہ جب پچھے بعد
دیگرے حیدر آباد دکن کے موافق اور مقبول عام روزنامہ
سیاست میں شائع ہوتے رہے تو ختنہ تقاریبین کی ولی خواہش
تھی کہ ان کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہو تو بہتر ہوتا
چنانچہ خود فضل مؤلف نے یہ ضرورت محسوس کی اور ان
مفہایں کو نہایت سیلسلے سے ترتیب دیا اور حیدر آباد کی
چار صد سالہ تقاریب کے موقع پر اپنی لکھنؤ خاص کر
اپنی علم و تحقیق کو ایک گران قدر علمی و تحقیقی کتاب کی دعائیت
جیسا کہ فاضل مؤلف نے لکھا ہے "محدود و ساکن کی وجہ سے
مشکل بلکہ حال تھی مگر جا بہ عابد علی فان ایڈریٹر سیاست
اور جناب محبوب حسین جگر صاحب جائیز ایڈریٹر کی حوصلہ
افزانی اور ادب نوازی کی وجہ سے ادارہ سیاست کل جانب
سے نہایت نفعاست اور عمدگی سے شائع ہو گئے ہے۔

اٹھیہ دوسرے بیچی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک
خوش آئندہ مژدہ ہے کہ جناب داکٹر سید داؤد اشرف صاحب
پہنی تحقیقی سرگرمیوں کو اسی عزم کے ساتھ جاری رکھے چوئے
ہیں۔ چنانچہ روزنامہ سیاست میں اس طرح کے آڑ کا یوز
ریکارڈ سے مزید تاریخی یادگار مفہایں شائع ہوئے ہیں۔ ہم
اسید کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور آئندہ سال نو
کا تحفہ ان کی ایک اور تالیف ہمارے ہاتھ میں ہو گی۔

جہت سری سے دہ جاگ کر تیار ہونے لگا۔ ثرث پہنچتے ہوتے ہیں
فہرست سے لات مار کر بیوی کو جیکایا۔ "اگلے سال" وہ ہر بڑا رُملی۔
اس نے ثرث اس کے مُرد پر چینکا۔

"کیا مہا؟"

"ایک ہی شرٹ تھی۔ بچاڑ دی۔ سال کتنا؟"
وہ تو بھی لتا ہے۔ بیوی نے اسی لہجے میں جواب دیا۔
ایک نتائجے دار طمانجہ بیوی کے گال پر پڑا۔ جا۔ بچہ سے
مرنے تاکاٹے کے آ۔ جلدی سے۔

وہ غریباً۔ میرے کو باسو سے ملنے جاتے ہے۔ بیوی کو اُسے
بنا فحشر کیے دیکھا اور دبی "تو تار تاکاٹے کو؟"
تم نوک کے لیے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ بسیاری لیندا۔ وہ بے چار
کوں ہے ساکھی دینے والا معلوم نہیں اس کو..... یہ کہہ کے اسے
خیال آیا کہ بیوی تو کچھ نہیں جانتی ہے..... اس نے دیکھا اس کی
بیوی اُسے گھومنگا ہے جیسے اُسے جوہی اگیا ہو کر۔ وہ کیا کرنے کیا
چاہا ہے۔ اور اس نے پھر ایک طمانجہ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔
بیوی کا نہ ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اسے گالیاں دینے لگی۔ پوری بستی میں بیک
ساشور تھا جیسے ساری طور تین گالیاں دے رہی ہوں۔ اس نے ب
ہاتھ خص سے دیکھا جیسے ہاتھ پر تازہ خون کے رجھتے ہیں۔



عزیز قیسی

ڈائی

ادھر سے دیکھو تو اس کے چہرے کا یہ پر فیل کتنا سہاڑا ہے
 وہ ایک پیاری شفیق سادہ حسین مان ہے اور
 اس کی گودی میں ایک بچہ ہمک رہا ہے وہ اپنی چھاتی کو
 کھولتی ہے اور اپنے بچے کے سر کھے ہونٹوں کو لانے
 جنہرے انگلیاں خجنزوں سی اکڑی ہیں اور ناخنوں
 لہو کے رس سے بھگو رہی ہے اور اس کی پاکیزہ آنکھ
 کے کناروں سے نور جیسے امداد رہا ہے
 کھلیہ لہو کو رہ رہ کے چاٹتی ہے

 ادھر سے دیکھو تو اس کے چہرے کا یہ پر فیل کتنا ڈراؤنا ہے
 وہ اک بھی انک مہیب بدشکل کالی ڈائی ہے
 میں چھتا ہوں یہاں سے دیکھو تو اس کے چہرے کے
 دانت جس لئے لہو سے بھیگے ہوئے میں اس کے بدن
 دوں رخ پکانٹوں سے بال ہیں جلد اس کی جذام کے پیپ
 دیکھ پاؤ گے !!

 یہ وہ جگہ ہے جہاں پچھے ہیسا کوئی پاکی ہی پاؤں ہوتا ہے
 یہاں سے پہ کون دیکھتا ہے
 یہاں ذرا سی بھی لڑکھڑا تو نیچے کھائی ہے اب گردوں کی

عزیز قسی

شہرِ خدا ترساں میں

سب ہی تالوں کی چھوٹی بڑی چاہیاں
 کھلے بانار میں روز بکتی ہیں)
 پھر جس طرح بنا پڑتے
 دوسروں کے ٹھکانوں کے تالوں کو سب کھول لیتے ہیں۔
 اور جس قدر بن پڑتے
 اپنی جیسوں کو بھر کر
 ٹھکانوں پر اپنے پلٹ آتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں
 مال و اسیاب محفوظ و مقبول ہے
 آں و اولاد رامون و مکفول ہے
 عورتیں پاک و مستور ہیں
 شکر کرتے ہیں اپنے خداوں کا۔ اور یہ دعا
 مانگتے ہیں
 کہ بیوی ہی سدا ساتھ ایمان اور آبرو کے
 سلامت رہیں

مال و اسیاب پر
 آں و اولاد پر
 ما تھد آئی ہوئی عمر توں پر
 دہ ہر روز اپنی دراثت میں پایا ہوا
 تالا جب ڈال دیتے ہیں
 چاہی کو جب جیب ہیں، اپنی محفوظ کر لیتے ہیں
 تب ٹھکانوں سے باہر نکلتے ہیں
 (سب کے پاس ایسا ایک ایک تالا ہے
 سب کو تھین ہے کہ اس تالے کی دوسری کوئی
 چاہی نہیں
 مگر ذہن دل، دین و ایمان، جنون و خرد،
 جسم و جاں کے بندھے ان بندھے دام پر

عزمیہ قلبی



الجھاؤ کا مزہ بھی تری بات ہی میں تھا
 تیرا جواب تیرے سوالات ہی میں تھا
 سایہ کسی مکیں کا بھی جس پر نہ پڑ سکا
 وہ گھر بھی شہر دل کے مضافات ہی میں تھا

 الزام کیا ہے یہ بھی نہ جانا تمام عمر
 ملزم تمام عمر حوالات ہی میں تھا
 یاروں کو انحراف کا جس پر رہا غرور
 وہ راستہ بھی دشیت روایات ہی میں تھا

 اب تو فقط بدن کی مرقت ہے درمیاں
 تھا رب طیجان و دل تو شروعات ہی میں تھا
 بمحکمہ جو قتل کر کے من آتا رہا ہے جشن
 وہ بد نہاد شخص مری ذات ہی میں تھا

عزیز قلبی



تمیز اپنے میں غیر میں کیا تھیں جو اپنا نہ کر سکے ہم
 ہر ایک محفل ہوئی گوارہ تھا ری محفل سے کیا اٹھے ہم
 سحر پیشان آرزو ہیں چہار باغ شب تھے سو جل بجھے ہم
 خارج اشکوں کا خون دل سچے جو ہم کو لینا تھا لے پچکے ہم
 نہ شمع کا پنی نہ گیت ڈوبے لٹھ جو ہم ان کی اونچن سے
 چلو بس اپھا ہوا کہ ایسے کہاں کے محفل فردوس تھے ہم
 نہ ہم سیاہی نہ ہم اجالا چراغ میں اشک آرزو کے
 لکھ ہم سرہ دشت بیکراں ہیں سلگتے رہتے ہیں شام سے ہم
 نظر اٹھاؤ تو جھوم جائیں نظر سر جھلاؤ تو ڈگ کلائیں
 تھا ری نظر وہ سیکھتے ہیں طریق ہوت وحیات کے ہم
 کریں جو شکرہ زبان کہاں ہے زبان میں تاب فخال کہاں چلے
 کہاں کا پر دریں کیسی غربت دلن کی گلیوں میں لٹ گئے ہم
 ہماری رو داد مختصر ہے وفا کہاں گی جنا کہاں کی
 برنگب گل مسکرا دیے وہ بہ طرز شہبم بکھر گئے ہم
 عزیز قلبی کہاں رہے ملکہ رات اس بستی کی اونچن میں
 بیجوم نغمہ میں ذکر من کر کی دو انسے کا روپ بڑھے ہم

۲۵
عزیزی

ریاحیات

○

ہر تازہ ستم تازہ کرم ہوتا ہے
ٹوٹا ہوا دل سا غرِ جم ہوتا ہے
اسے ہر زندگی کی تباہی پنه جادا
اجڑے پہ بھی بت خانہ حرم ہوتا ہے

ہر لمحہ نو، مرحلہ و منزل نو
بہتے ہجئے اک نظر میں منظر سو سو
ٹھیرے نہ کہیں وقت کی یہ رود روای
لوٹے نہ کبھی زندگی کی زندگہ رد

○

موقوف ہے سر کوہ وہ جلوہ کب سے
سدود نزولِ من و سلوانی کب سے
رزقِ شکم و حشم پہ ہے چھین جچپٹ
برپا ہے تن دروح میں بلوہ کب سے

تیرا ہے زمانہ - نہیں - میرا بھی نہیں
بیگانہ نہیں ہے - نہیں - اپنا بھی نہیں
ہے سب کو بھرم سب سے ہے رشتہ اس کا
جو سب کا ہے دنائل کسی کا بھی نہیں

○

یوں وقت کے پہنچے سے بندھا ہوں یارب
گردش میں ہوں چاہوں کہ نہ چاہوں یارب
شانوں پہ لیے پھرتا ہوں میتست اپنی
میں عین جوانی میں مرا ہوں یارب

غم گرچہ ہیں بے شمار سہنے کے لیے
خوشیاں بھی ہیں صد ہزار کھنے کے لیے
اک پل کی شکست خاب کافی ہے مگر
تامغر بہاں اداں رہنے کے لیے

○

دیوانہ بن اگئی ہیں آنکھیں تیری
آنکھوں میں سما گئی ہیں آنکھیں تیری
پچھے تجھ کو خبر بھی ہے غزالِ رضا
خوبجھے پر بھی چھا گئی ہیں آنکھیں تیری

○

خوابیدہ سمندر پر جھکے تھے بادل
آئینے پر آکرڈ کے تھے بادل
اک موڑج صبا اڑاگئی گیسو درنا
رخسار ترسے چوم پچکے تھے بادل

○

پھالے پڑے آنکھوں میں شرابوں سے
یا رائیں اچانک وہ نم آنکھیں ایسے
وہ کرب ہے ان جانے میں ناخن میں کبھی
دھن کر کوئی سوئی ٹوٹ جائے جیسے

○

آنکھوں پر پڑا وقت یہ ٹھل جلتے گا
پھونکے سے یہ تنکا تو نکل جائے گا
لیکن یہ ترا قرب یہ سانسیں تری گرم
لگتا ہے بد ان میرا پگھل جائے گا

○

سنکے گی ہوا۔ گھٹایے چھٹ جائے گی
سینے پر دھری چٹاں ہٹ جائے گی
حسوس یہ ہوتا ہے دم فک کر کبھی
گر شعر نہ ہو سانس الٹ جائے گی

○

شکوے گلے آنسوؤں میں دھلاتے دیکھے
تارے کئی پلکوں پر لگھتے دیکھے
الفاظ کو شمعوں میں بدلتے دیکھا
پانی میں کئی چراغ بلتے دیکھے

○

سامان خود خواب سے جو دوری ہے
ناکامی چہہ ہے کہ معدود ری ہے؟
دنیا نہ مل تم کو کہ چھوڑی دنیا
یہ ترک دکھل ہے کہ مجھ سی ہے؟

○

امر برسانے والی آنکھیں تیری
یہ زہر بلانے والی آنکھیں تیری
زندوں کو مٹا دتی ہیں اک جن بش میں
مردوں کو بجلانے والی آنکھیں تیری

مشکل ہے ہنر زمانہ سازی مل جائے
ممکن نہیں طرح دل نوازی مل جائے
اس واسطے تج دی ہے یہ دنیا کہ ہمیں
دنیا ہی سے دادیے نیازی مل جائے

ارمان ہوش شوقِ تقاضا نہ رہے
دنیا میں رہیں خواہشیں دنیا نہ رہے
مرتے ہیں شب دروز اسی کوشش میں
جیتیں ہیں جینے کی تمنا نہ رہے

پن مانگ کے میتربھے دولت ہو جائے
کوشش کے بغیر عیش کی صورت ہو جائے
اس دور میں شہرت سے میں گھبرا آتا ہوں
اے کاش اسی بات کی شہرت ہو جائے

میلے میں جو دنیا کے اکیلا ہوں میں
حضرت کشِ شہیر و تماشا ہوں میں
دلکھے کوئی نا اداز دے سوچے مجھ کو
یوں بھیرے سے دور دور چلتا ہوں ہیں

اہم تاریخی دستاویز

آسمانِ جاہ

کا
حیدر آباد

(سیاسی رقبتوں کا دور)

مصطففہ رمن راج سکینہ

قیمت : پو بیس روپے

ناشر :

حصہ بک ڈپو، چھلی گان حیدر آباد (السے پی)

ذکرہ دربار حیدر آباد

مؤلفہ رمن راج سکینہ

عہدِ اصفیہ کی اہم سیاسی و ثقافتی تاریخ
ناشر: ترقی اردو بیور و حکمرانی تعلیم

قیمت ۲۰ روپے

ملنے کا پڑا:

ترقی اردو بیور - ولیٹ (۸) آر سی پورم

عنی دہلی - ۱۱۰۶۶

۲۸
سری نواس لامہوی

پھر و فیضِ حبیب الرحمن سیرت و شخصیت

(جن کا ۱۵۔ مئی ۱۹۹۱ء کو کراچی میں انتقال ہوا)

گیا جہاں ان کے ساتھیوں میں پر فیضِ حبیب الرحمن تکمیل نہ کر ائمہ جن کا بعد میں لندن میں بھی ساتھ رہا۔ دارالعلوم میں تعلیم پانچ سال کے ساتھ ساتھ ی خانگی طور پر اٹگریزی کا درس لینے کیلئے مفید الاسماء ہائی سکول کے ایک ستارہ میڈیم کے پاس جایا کرتے تھے جہاں ان کا ساتھ دام لال صاحب سعید ہوا۔ جنہوں نے بعد میں مدرسی محل کے رکن کی حیثیت سے ٹیکنیکی کام کیا اور اس وقت بھی بقیہ حیات ہیں۔ انگریزی تعلیم کے حاصل کرنے کا ذکر انھوں نے اپنے والدین سے نہیں کیا لیکن جب اس کی بھنک انھیں پڑی تو وہ اس میں مانع نہیں ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۱۳ء میں مدوسہ افیکر کے ذریعہ میڈیل کا استوانہ پاس کیا۔ میڈیل کی کامیابی کی مندائی بھی آسفیہ اسکول کی لاابریری میں آدمیاں ہے جس کے وہ جو بھروسہ سمجھا عزازی بھی رہے۔ پنجاب میڈیل کا امیاب کرنے کے بعد چند دنوں تک وہ نظام کالج میں شرک رہے جہاں ان کے ہم چaut نواب ہمدی فائز جنگ اور فاب دینا یا رجھ بہاں تھے۔ لیکن اس کے چند دنوں بعد انھوں نے ایم۔ ای۔ اور کالج علی گزار میں داخلیے لیا جس کا الحال اس وقت الہ آباد یونیورسٹی سنتا۔ جہاں سے انہوں نے ایم۔ اے۔ ای۔ ای۔ بن کر الگ ہوا ماحصل کیں۔ ایم۔ اے۔ اور کالج میں الٹکے ساتھیوں میں تھے جن

ایک انگریز م Fletcher کا قول ہے کہ کچھ لوگ پیدا شی بڑھے ہو اکرتے ہیں اور کچھ لوگ اپنی صلاحیت اور کوشش سے بڑھے بلنتے ہیں۔ ایسے ہی بڑھے لوگوں میں سے ایک پر فیضِ حبیب الرحمن تھے۔ جنہوں نے اعلیٰ تعلیم، محنت اور جفا کش تنفس و تذہب کے ذریعہ اپنی شخصیت کے سونے کو کندان بنایا اور اپنے دماغ کی روشنی سے اُردو تحریک کو دھنیا بخش کر اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شخصیت کیا ہے اس پر بحث کا یہ موقع نہیں ہے لیکن اجمی طور پر شخصیت ان جسمانی اور اخلاقی صفات کا ایں جموعہ ہے جن کی بدولت کوئی فرد عام لوگوں سے امتیاز حاصل کرتا ہے اور میں حبیب الرحمن صاحب کے اسی امتیاز کا ذکر دوں۔ حبیب الرحمن صاحب کے آباد اجدا دنیلوں سے حیدر آباد آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ان کے والد جناب محب الدین حبیب نواب فخر الملک بہادر کی مشی کے ممتاز تھے جو اس زمانے میں ریاست حیدر آباد کے سیاہ و سفید کے کرتا دھرتا کہلاتے تھے۔ اگست ۱۸۸۹ء میں حبیب الرحمن صاحب حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق مکمل ہوئی اس کے بعد انھیں دارالعلوم میں شرک کردا

"ہندوستان کے معاشی مالات" A BOOK
ON ECONOMIC HISTORY OF INDIA)

جسیں کتابوں کے ترجمہ کیے جو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی جانب سے شائع ہوتے۔ ان کے ترجمے نہایت بیشتر اور ملیس زبان میں ہیں اور جن لوگوں نے ان کو پڑھا ہے ان کا خیال ہے کہ ان کتابوں کے اس سے اچھے ترجمے نہیں ہو سکتے تھے۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ درس و تدریس اور تصنیف و ترجمہ کا اتنا زیادہ کام کرنے کے باوجود انھیں معاشیات کے موضوع سے بعد میں دلچسپی باقی نہیں رہی۔ جامعہ عثمانیہ سے الیاس برلن صاحب کے پہلے جانے کے بعد یہ معاشیات کے پروفسر بنائے گئے اور ساتھ ہی ساتھ حیدر آباد سیول سروس میں کچھ کلاس سمجھیں۔ ان کے ذمے کی گئیں۔ سیول سروس کے انکے شاگردوں میں دوسرے کے علاوہ ایں این گپتا، شیوکار لال، اور ظہیر احمد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انہیں ترقی اور درج کے قیام کے بعد ایں این گپتا نے ان کی اتنی مدد کی کہ وہ ہمیشہ ان کے معرفت فر رہے۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک یہ انگلستان میں رہے جہاں انہوں نے لندن اسکول آف اکامکس سے آرزو کیا اور پھر آکسنورڈ میں ایک سال تک از علی میثیت کے شعبے میں زیرِ حفظ فیلو رہے۔ لندن کے ان کے ساتھیوں میں شہر کوپٹ کیڈر بی۔ ایل بیڈی، مسٹر فریڈا بیدی اور بی۔ سکے نہر کے نام نہیں ہیں۔ پروفیسر ہیرالدلاسکی اور پروفیسر سی۔ ای۔ ایم جوڑ کے چھتیے شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا جو اپنے اخترائی خیالات کے لیے مشہور تھے۔ یہاں ان کے جواں مرک ساتھی ایں حسن صاحب لاہوری ذکر ضروری ہے جو علی گڑھ، لندن اور جامعہ عثمانیہ میں ان کے ساتھی اور غاصص دوستوں میں سے ایک تھے۔ ۱۹۳۶ء میں یونیورسٹی اطلاعات، ٹائمز کے ناطم بنائے گئے اس کی

ذکر کی کتاب "اور حسین" پر پروفیسر رشید احمد مسٹر لفی اور غاب اکبر علی خاں بارٹ لائیں جو بعد میں جامعہ عثمانیہ میں ان کے شاگرد بھی رہے۔ علی گڑھ سے والپسی کے بعد ان کا ابتدائی تقریب مکار پروفیسر کی حیثیت سے جامعہ عثمانیہ میں ہوا اس وقت پر پروفیسر الیاس برلن صاحب مسٹر شمعہ معاشیات تھے۔ ان کے تقریب کے مسلسل میں پر پروفیسر عبدالستار مسٹر لفی نے بڑی مدد کی اور جب بھی ان کا ذکر کیا مسٹر الیاس برلن صاحب بڑستا حرام سے ان کا نام لیا کرتے تھے۔ اس وقت جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم اور تدریس اور جیب اور ترجمہ صاحب اور دو میں درس دینے میں اتنے کو رکھ کر دبیری بار کلاس میں جانے سے بچ کر رہتے تھے لیکن الیاس برلن صاحب نے ان کی تھمت بندھائی اور کلاس روکم کرنا نہیں چھوڑنے لئے۔ جب انہوں نے اپنی زبان کھولی تو چند شانیوں تک ان پر بیشان بہتے لیکن بعد میں وہ اس قدر کامیاب استاذ ثابت ہوئے کہ ان کے طالبو علم انھیں غرضدار تکمیل یاد کرتے رہے۔

جامعہ میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تصنیف "ذا لیف کا کام" بھی جاری رکھا۔ ان کی پہلی اور قابل ذکر کتاب "معاشیات" تھی اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ معاشر ہی سے مفہوم کو ہافم فلڈ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے "ملکی کسادی یا زاری کے اسباب"۔

(CAUSES OF WORLD DEPRESSION)

"محصول اندازی کے اصول اور طریقہ"

A BOOK ON PRINCIPLES & METHODS
OF TAXATION

"میادلات خارجہ"

A BOOK ON FOREIGN EXCHANGE

ہی ایک دا تریشیں آیا وہ یہ تھا کہ ان کے ملکہ کا یک مجمع
مسلمان پرستا کار ہونے کا بھروسہ اسلام کا درجہ کے ملکہ اعلیٰ
بڑھنی کی فیض سے سفارش کی گئی تھی لیکن جب مرحوم صاحب
اس شخص سے ذات طلب پرواق فتح اخوند اخوند کی
تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے اُسے دوبارہ مدد کرنے کے
سفارش کی۔ اس پرستہ دعائی صاحب اتھے پر لٹ پاہنے کے
جلیب الرحمن صاحب سے پوچھ بیٹھ کر یا پس نے کیس سفارش
کی ہے۔ اخوند نے اس پرستہ سے اس بیچ میں حساب دیا اور
کہا کہ میں نے حقائق بیان کر دیے ہیں اب یہ کام آپ کو ہے کہ آپ
میری تجویز کو مانیں یا رد کرو۔ لیکن بعد دعائی صاحب کا اصرار
تھا کہ وہ اس کی بڑھنی کی سفارش کریں۔ اس بات سے جب
 الرحمن صاحب نے صاف انکار کر دیا اور ان کے اجل اس سے
انکھوں پر چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ مفتوا درست کے تعلقات متسلسل
نہ ہوں تو غنکے کے کام کا انصرام فیک ڈھنگ سے نہیں چل سکتا
اوہ یہ سورت حال دلائل برقرار رہی۔ اسی مسئلہان حکومت کی جانب
ایک گشتوں جاری ہوئی کہ جو ملکہم سرکار اپنی ملازمت کے پیشہ مل
پورے کر لیے ہوں وہ اُنچا ہیں تو ذمیطہ ماحصل کر سکتے ہیں۔
جلیب الرحمن صاحب نے اس موقع کو نیمت سمجھا اور سرکاری
ملازمت سے ذمیطہ پر سبد و شی ماحصل کیا۔

ذمیطہ میں خدمت سے بخلوں ہونے کے بعد ان کے
پاس کئی افزاں نہیں تھی اک پاکستان والوں نے بھی اخوند کی لیکن
انہوں نے انکار کر دیا ہے ۱۹۵۰ء کا زمان تھا۔ اس وقت ان کی
انجمن ترقی اردو کا احیا عمل ہیں آپ کا حصہ اور اس کے مستشرقی ہمیں
قائمی عبد الغفار نبانے کے تھے یہ وہ اور پہلی تحدی اللہ جنہیں
کئے اور انہیں کی شاخ کے قیام کے سلسلے میں جلیب الرحمن صاحب
سے ربط پیدا کیا۔ قاضی صاحب جلیب الرحمن صاحب نے اسی

کہاں بھی بڑی دلچسپی سے ہوا یہ کہ ۱۹۳۳ء کے اوائل میں
پوز میں ایک معاشریہ الفرنس کا انعقاد عمل میں آئے والا تھا کہ
کے مددرا بر جیدری بنائے گئے تھے اور وہ جاہستہ تھے کہ
ان کا صدارتی خطبہ ایسا ہم کہ ہر سنتے والا چونکہ جائے۔ جو م
احمد محی الدین جو بعد میں مرکزی حکومت کے ڈپٹی منظہ بنے
انہوں نے سربرا بر جیدری سے جلیب الرحمن صاحب کا ذکر کیا تو
انہوں نے کہا کہ اخوند سے آئیں تاکہ خطبہ صدارت پر بات پیش
کی جاسکے۔ جب احمد محی الدین صاحب نے اس کا ذکر صبیب
الرحمن صاحب سے کیا تو انہوں نے چلنے سے انکار کر دیا اور
کہا کہ جو جو سے "جمی حضوری" نہیں ہو سکتی۔ لیکن احمد محی الدین
صاحب نے جان کے علی گڑھ کے ساتھیوں میں سے تھے اخوند
کسی طرح پسے آمادہ کر لیا اور سربرا بر جیدر کے گنگو کے بعد
انہوں نے خطبہ تحریر کر کے احمد محی الدین صاحب کے حملے
کر دیا۔ جب خطبہ صدارت کا الفرنس میں بڑھائی قراس کی اتنی
تعریف ہوئی کہ سربرا بر جیدر نے ان کو نا فرم اہل دنات نہ
بنادیا جہاں وہ چھ سال تک بھیتی ناظم کام کر لئے کے بعد
۱۹۴۲ء میں ناظم صفت و حرفت بنائے گئے اور ۱۹۴۶ء میں
وزابہ مہدی نواز جنگ بہادر کی جگہ انہیں سعید صفت و
حرفت بنایا گیا۔ جب یہ سعید صفت و حرفت تھے تو پویس
ایکش ہوا اور اس کے بعد کانگریس کی قائم کردہ فی مکوہتے
مسلمانوں اور خاص طور پر مسلم ملازمین کا عرصہ حیات تھا
کر دیا ان میں سے ایک جلیب الرحمن صاحب بھی تھے۔ اس
وقت ان کے محلے کے انبارج ایک آئی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ سی۔ پر
پر دھان تھے جو اہمیت متصف اور تنگ نظر واقع ہو سکتے
جب کوئی ناول ان کے پاس جاتی تو وہ یہ دیکھتے کہ جلیب الرحمن
صاحب نے کسی مسلمان کی تو کوئی سفارش نہیں کی ہے۔ ایسا

دو کاؤن کی طرح قائم ہو گئی ہیں جا فشا نیوں جو ترقی اور پروج نفیب ہوا اس کے لیے ہمیں اعتراف کنا پڑے گا کہ یہ جیب الرحم صاحب کی فما روشن جا فشا نیوں کا نظر ہے ان کے کام کی سب سے بڑی خوبی تھی کہ وہ کوئی حال میں بھی امید واخلاص کا دامن نہیں چھوڑتے تھے اور نہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو اس کی اجازت دیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ کام کرتے چلے جاؤ اور یہ زدیک ہو کہ اس کا پھل میں رہا کے نہیں!

شمع کی طرح جیسی بزم گھرِ عالم میں خود جیسی دینہ اغیار کو بنیا کر دیں انہیں نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہوں یہ تو مستقبل کا موت خیزی تسلیے گا لیکن اس نے اغیار کو بنیا کرنے کی کامیاب سعی فرمادی ہے اور اس کا اعتراف مرکزی انہیں ترقی اردو (نہ) کو بھی ہے۔

انہیں کئے قیام کے بعد جیب الرحم صاحب کا دوسرا بڑا کار نام اردو ہال کی تحریر ہے۔ اس کے لیے انہوں نے لاکھوں روپے کی زمین بطور عطیہ دی۔ اس کا افتتاح ۱۹۵۶ء میں اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ اس کے بعد اردو ارٹس (ایوننگ) کالج کا قیام ان کی فکر و عمل کا ایسا آتش کندہ ہے کہ اس کی ہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اردو ذریعہ تعلیم کا اہم حصہ ہے لیش میں نہیں بلکہ ہندوستان کا پہلا کالج تھا جس کے بعد دوسرے کالج سے کسب فیض کیا۔ اس کا لمح کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے قیام نے جامو & شہانیہ میں دوبارہ اردو ذریعہ تعلیم کو جنم دیا اور آج تو وہ اردو کی اعلیٰ تعلیم کا ابسا رجھتھر ہے کہ آئندہ نسلیں اس سے بھول نہیں سکیں گی۔ جس طرح سے پیسیں ایکشن کے بعد اردو کو نیت دنابند کر دیا گیا تھا لیکن انہیں کے

اظہار عاتی خامہ تھے اس لیے کوئی وقت بیش نہیں آئی پہلے تو جیب الرحم صاحب نے حبِ عادت انکار کیا لیکن جب قرآن نکل نہیں کے نام نکلا تو انہوں نے مزید انکار نہیں کیا اور اردو والی کتاب ایک اجتماعی اپنی کوشش پر بلوایا جس کے لیے انہوں نے تقریباً ۲۰۰ دعوت نامے جاری کیے جن حضرات کو مدعو کیا گیا تھا ان میں سے اکثریت کی اادری زبان اردو تھی لیکن ان میں سے بہت سوچنے یہ کہ کہ شرکت سے انکار کر دیا کی پہلے ہی مسلمانوں پر افات ناہیں ہے اس پر جیب الرحم صاحب انہیں اور بصیرت میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے بعض غرر مسلم دوستوں نے ان کی ہمت بندھائی ہے جس میں مشکل سے (۲۰) حضرات نے شرکت کی گر جیب الرحم صاحب نے ہمت نہیں ہے اور اردو کام شروع کر دیا کہ میں اکیلا ہی چلا تھا جا بانہ منسل گر

لوگ ساختھا تے گئے اور کار وال بنتا گی
اوہ گائی کار وال کتنا بڑا اور وسیع ہے اس کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتے ہے۔ اس کے بعد سے جیب الرحم صاحب اردو زبان کی بقاد ترقی کی تدبیروں میں استثنے مصروف ہو گئے جہاں پھول چند اور کائنٹے زیادہ تھے اس کو انہوں نے گلزار بنادیا۔ انہیں کے قیام کے بعد حیدر آباد اور آندھرا پردیش کے طول و عرض کا انہوں نے درہ کیا اور جہاں کہیں بھی گئے ہاں کے لوگوں پر اردو کی افادیت اور ادری زبان کی اہمیت کو واضح کیا۔ چند ہی سالوں میں انہیں نے حیاتِ نو حاصل کر لی اس میں حرارت اور نہ نگاہ کے آثار نمایاں ہونے لگے جس کا اندازہ انہیں کی سالانہ رپورٹوں سے کیا جاسکتا ہے اور اردو تحریک کی افادیت آسانی سمجھ میاں سکتی ہے۔ یہاں وہ جسے کہ آج انہیں ترقی اردو کو با وہود کہ اردو کی اب کئی دلکشی پیش اریوں کی

دستے ہیں اور تہذیبی سفیر و دل کے خطا بات سے سرفراز بھریتے ہیں مگر ان افراد کو تنقیح نہ کر دیا جاتا ہے بخوبی نسبہ درج اندھکی خدمت کی اور سینکڑوں کی اڑکن کام کرنے کے لئے گلایا۔ اس موقع پر ہو لانا آزاد کاری قتل یا فاما کا ہے تو۔
دو جب انسان بے فرش ہو جاتا ہے تو وہ بے یادیں جاتا ہے۔

جیبِ الرحمن صاحب کی اندھو سے والہاد را بخشی اپنی بھی بے پناہ بنائے رکھی۔ انہوں نے حیدر آباد میں اردو کیلئے ہمیں سمجھنے کی زندگی لگا دی اور وہ نہ ان کے ساتھ کام کیجئے تو انہی اس بات کی گواہی دیتے کے الی ہیں۔ میں وہ کوئی مختلف حصوں میں جن شخصیتوں سے مذاخرہ ہوا ہوں ان کی تصادم خپڑے ہنسنے کے باوجود بہت ایہم ہے انہیں سے ایک پر فخر جیبِ الرحمن صاحب کی تخفیت ہجر رہے جو انکی سرگردانگی میں مجھے تقریباً (۳۵) سال تک اردو کا کام کرنے کا خوف ماضی رہا۔ اس لیے مجھے یہ لمحہ کی اجازت دیجئے کہ جیبِ الرحمن صاحب کی خدمت میں خارج تحریت پیش کرنے کا سب سے اچھا درج یہ ہے کہ ہم ان کے مشن پر دشمن ہیں اور ہم سلطنت پر اس کے لیے جلد جہد کریں اور انہوں نے جو ادارے قائم کیے تھے انہیں اور ترقی دیں تاکہ آئے والی اردو شعلہ کا مستقبل تابدا کہہ کے انہیں زندگی ایجاد و قربانی کی ہتھیاری زندگی رکھی ہے ان کا خاتمہ کا امراض دراصل اپنی ہی بصارت اور رہبرت کے لئے اڑا ہے ان کی پیروت و تختیت تو شادر کے اس معروف انشا تھی۔

ایک تصویر ہوں میں رات کے کٹ جسٹنگ کی ۔۔

قائم نے حکومتی ایڈاؤں کے سکون آمیز چیز بچوں میں ایسا یقین روکھا کیا کہ اس کی لہر وہیں ہے اُج بھی حرکت پائی جاتی ہے اسی طرح سے اُردو ارٹس کا الجاق قائم مادری زبان کے ذریعہ تعلیم کا ایسا سنبھل میں ہے کہ اس کی وجہ سے مادری زبان میں الگ کے حصول کو ایک سلسلہ حیثیت حاصل ہو گئی۔

جیبِ الرحمن صاحب ہیشہ محل سیاست سے دور رہے لیکن ایک بار وہ اتنے بجور ہوئے کہ انھیں کل ہندوستان میں مشاہدے کیلئے صدر کا عہدہ قبول کرنا پڑا۔ وہ سیاست میں ہمہیں علاحدگی پسندی کی سخت مخالفت کرتے رہے اس کا ثبوت ان کا وہ خطیب استقبالیہ ہے جو انہوں نے کل ہندوستان مجلس مشاہدہ کے اجتماع کے موقع پر جو حیدر آباد میں پڑھا تھا۔ اس خطیب میں انہوں نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے مشورہ دیا تھا کہ "مسلمانوں کیلئے یہ ضریب نہیں ہے کہ وہ انتخابات لٹنے کے لیے اپنی ایک حنفی اسلامی پارٹی بنائیں۔" اسی طرح ان کے لیے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ خود کو کسی ایک سیاسی پارٹی کے ساتھ ہمہیں کے لیے والست کر لیں۔ یہ بات مناسب ہی نہیں بلکہ ناامن ہی ہے۔ آپ کس طرح تصور کر سکتے ہیں کہ سارے مسلمان ایک ہی سیاسی نصیر یا آئینہ یا لوچی کے ہاتھ بن جائیں۔ آگے چل کر وہ فراتے ہیں لہجہ ان تک ملکی سیاست اور پارٹیاں اور وہ سرے انتخابات کا تعلق ہے وہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے نسب اصول اور پروگراموں کو کیکے کر اپنے سیاسی شور کے مطابق کسی نہ کسی پارٹی میں شرکیہ ہو جائیں چاہے وہ کائنگزیں پارٹی ہو یا کیونٹ پارٹی یا سو شنست پارٹیاں یہ خطبہ ان کی سیاسی وسیع الشظری اور غیر فرزدواری سیاست کی نشان رہی کرنا ہے۔

ہمارے دیس میں یہ روانچگریت سے جیں پڑا ہے کہم غیر اہم شخصیتوں اور اداکار بات بات میں تعریف و توصیف کے پیلے باندھ

اب وقت بہت کم ہے

○

اب وقت بہت کم ہے
ملنا ہے تو مل جاؤ
تم کو تو خبہ ہوگی
ہم عمر کی کس منزل
کس موڑ پر آپنے
اس موڑ پر اکثر دل
مل کر بھی نہیں ملتے
سب دیکھتے رہتے ہیں
اور سوچتے رہتے ہیں

پتھر کی طرح گم سسم

○

اب وقت بہت کم ہے
ملنا ہے تو مل جاؤ
ایسا نہ ہو یہ موسم
یہ عالم بے خوابی

یہ منزل بے تابی
ما تھوں ہے نکل جائے
یہ شمع پکھل جائے
اور دیکھتے رہ جائیں
اور سوچتے رہ جائیں

پتھر کی طرح ہم تم

سلسلہ

تم لا بعمر پیکر ہو کہ میرا جو کہ مریم
بھڑ کو نہیں معلوم کہ تم کون ہو کیا ہو
تم نے مری آیات سخن میں مجھے دیکھا
اور تم وہ حقیقت کہ حفاظت نہ ہو
ہر دور میں ہم تم تھے محبت کی علامت
رادھا کی طرح تم تو کرشنا کی طرح میں
ہم میں وہی رشتہ ہے جو ہے ارض و مالیں
تم پاریتی صی ہو، شیوا کی طرح میں
ہم آئینہ و حکس کے ماند ہیں لیکن
میں دیدہ بیدار ہوں اور خاپ صفت تم
دو دل ہیں اور اک عالم ہجران کی سات
خورشید صفت میں ہوں تو ہتایب صفت تم
اک سورج نیم سحری ہے کہ روایا ہے
جو آنکھ سے او جمل سہی نزد لگ بیا ہے

حیدر الماس

اشاعت

طواف

یہ چمک دلانکھیں
 ساری دنیا طعنہ زن تھی
 کن لیے
 مقام مقدس ایں میرے لیے
 میں یہاں
 بیمار پیڑوں
 دوسرے جھاڑیاں روذگر
 خشک پھرلوں
 خارزاروں کے اُدپنے شجر پھاندر کر
 نرمی پہاڑوں
 چلچلاتی ہوئی دھوپ میں
 اور کارے جنگلوں سے گفتگو کرتی ہے وہ
 ریت پر چل کے آتا ہوں
 آج وہ پاگی سی لیکن منفرد رونگی
 سب ولے
 اُنکھے میں جذب ہوتے ہیں لیکن ابھرتے نہیں
 بہت سرو رہے
 تم بھی گھرائیوں سے نکلتی کھماں ہو
 گردخوردہ ساری چیزوں
 مگر زندگی ہے کہ
 اس کے سینے میں سمٹ کر آگئی ہیں
 تنہا طوافِ سلسلہ میں مصروف ہے

پروفیسر احسن رضوی

وہ تجربے

جانے کب

وہ تجربہ بھی کتنا کرنا کھا
کل جب ہم راستے میں ٹے
تھیرا ہمسایہ بنے نیازی کے ساتھ
سر جکائے ہوئے گزر گیا تھا
اور میں بھی نہ جانے لیوں۔ چاہ کہ بھی
اس سے مناطب نہ ہو سکا تھا
شاید ہم دونوں کے دلوں میں
کوئی چور تھا
بدگمانیوں کا
وسوسوں کا

او سط زندگی جینے کے بعد
مرا کر دیکھا
تو طے کیے ہوئے طویل راستے پر دور تک
جذب و جہد
قربانیوں
محرومیوں
او کشمکش سے بھری ہوئی
ناہماوار یا نظر آئیں
او راب
جب کہ ریاہ ہوا سہے
او راطیناں و سکون کے لمحات میسرا ہیں
تو پستہ نہیں
کہ کب یہ دل دھڑکنا چھوڑ دے

خواجہ شوق



متاع درد نہ سو غاتِ چشم تر لے جا
 اس انہمن میں ہستھی بی پور کے سرے جا
 تو جا رہا ہے تواش کوں کچھ گھر لے جا
 اگرچہ یہ ترے قابل نہیں گر لے جا
 بگاڑ دی ہے ہڑاک رسم ناشناسوں نے
 بہاں بھی جا نگہ د دل سنبھال کر لے جا
 گراں نہ روح پ گزیے مجموع خوابوں کا
 سفر دعا ز ہے سا بانِ خمیر لے جا
 وہ بے خبر ہیں نہ غم غیر معتبر اپنا
 صبا سے کیا کہیں رستا کوئی خبر لے جا
 کسی چراغ کا کیا کام بزمِ زندگی میں
 جو خاکِ دل میں ہے پوشیدہ وہ شر لے جا
 قفس میں قوز پناز ساخت دے کہ نہ دے
 چھن سے ذہن تو آزادِ بال دپٹے جا
 یہ میے کدھ نہیں محفل ہے آشنا کامی کی
 خود اپنے خون سے پیمانہ اپنا بھر لے جا
 بھروسہ شوق، الباسوں کا ہے نہ پھروں کا
 جو دل کی تہہ میں اتر جائے وہ نظر لے جا

اقبال متنی

کچھ اتنا بے نیاز ہوں جیسے کے باب میں
 جس طرح دریا خود کو چھپائے سراب میں
 آزندگی تلاش کریں کوئی اور زہرا!
 تیرے لیے تو کچھ نہ ملاب شراب میں
 دہ عالم فراق تھا اللہ کی پناہ
 ہر شے جلس رہی تھی شبِ ماہتاب میں
 تجھے کو ہی دیکھتی رہیں آنکھیں تو کیا کریں
 اک تو ہی بس گیا تھا جہاں شباب میں
 میں بھی جہاں سے اس طرح الٰہ جاؤں گا متنی
 جس طرح ترک رکھ کے اٹھا ہوں کسایہ میں

دیا رہا یار پر دل کا گمان ہو گا بھی
 مری نہیں کا کوئی اسماں ہو گا بھی
 میں تجھ کو چھوڑ کے اتنا تو بار رکھ لیتا
 قری نگی میں ہی، میرا مکان ہو گا بھی
 مری انا کو تراطف بھی نہ راس آیا
 تراہی دھیان کہیں درمیان ہو گا بھی
 بہت کڑا ہے اگر زندگی کی صوب تو کیا
 کہیں تو یادوں کا اک سامپان ہو گا بھی
 میں پھر برداہ ہی کلب خون پکیدہ ہی
 مگر یہ فاصلہ دو جہاں ہو گا بھی
 میں اگر بی کے عجی جاں سوختہ نہیں ہوتا
 سر شک غم ترانم، پاسباں ہو گا بھی
 نہ فرم، نہ ضبط فعال نے بھرم نہ تنہائی
 متنی کوئی تواب درمیان ہو گا بھی

غلام جیلانی

امیر کو سار

ان کا دھان پان جسم کسی چوگیا تھا۔ شیرا نے انہیں سیدھا لشکر دودھ اور شہر کا بادیہ اور جو کی تعلیم اٹھانے کی۔ ہابا نے چند گھونٹ پیے اور پھر آنکھیں بند کر لیں اور سبودھی کی آنکھیں آپ ہی آپ کھلتی گئیں۔ شیرا نے جھک کر پابا کی آنکھیں کو آنکھوں پر رکھ دیا۔

اور اسی لمحے نیچے پہاڑی پر ہل چل گئی۔ لوگوں کا خور ٹھٹھا گیا اور پھر وہ سب ڈھلانوں پر سے چڑھ کر پابا کے پاس پہنچا آئے۔ ان کے سانس پھولے چوٹے تھے اور آنکھیں خوف زدہ تھیں۔

پابا نے آنکھیں کھو لیں تو انھوں نے بتایا کہ ان کے سروں پر سے کوئی آسمانی مخلوق گزری ہے۔ جس کے پروں کے پھر پھر لئے کی آواز آسمان سے زمین تک گونج رہتی ہے۔ اور جس کے سلے میں ساری پہاڑی سا گئی تھی۔ کیا بابا نے اسے نہیں دیکھا؟

اور شیرا نے دیکھا کہ عربی کے بعد بابا کے ہنڑوں پر مکراہٹ آ رہا ہے۔ وہ اس کے سہا سے اندر کر جائے۔ اور بہت دیکھی آواز میں بولے۔ لوگوں نے ہو.... وہ فقنس تھا!

اور سب ایک دوسرے کامنہ تکنے لگے۔ "فقنس؟!"

جب سورج نکلا تو پہاڑی پر وہ ان کا پہلا دن نما جوں جوں دن بڑھتا گیا۔ پہاڑی کا ذرہ ذرہ دھوپ کی حدت سے جلنے لگا۔ چنانوں سے آگ کی پیش آنے لگیں لوگ ٹرے ٹرے پھر دیں اور جنگلی جھاتیوں میں دیکھ کر ٹر رہے۔ ان میں بوڑھے بھی تھے، پتے بھی تھے اور عورتیں بھی۔

کارے بھی تھے، گورے بھی اور زرد بھی۔ شیرا نے ان کی ڈھارس بندھائی اور پہاڑی سے نیچے اترنے سے منع کیا۔ پر دل طرف تباہی کی آگ ہے اور بیماریوں کی بار بھر ہے۔ اور بدروں کا راجح ہے۔ یہ دھرتی جوالاں کھی کے دہانے پر آسکھڑی ہوتی ہے۔ کسی بھی پل بھک سے اڑ جائے گی ... تم لوگ خوش قدمت ہو جو پہاڑی پر ترپکے۔

شرامن فقنس با بابا کی دعاوں اور رہبری سے تھاری نہیں زمین پر آدم کا نشان باقی رکھیں گی۔

نہ کن سے اور مسلسل جائگتے رہنے سے سب لوگ نہ ڈھال تھے۔ لوگ کے تھیڑوں میں بھی پٹ پٹ کر سو گئے۔

در جب جاگے تو در در سے دن کا سورج سر پر آ جکا نہ۔

شیرا پہاڑی کی ڈھلانوں پر سے چڑھو کر اور شرامن فقنس بابا کے تیکے پر پہنچا تو بابا زمین پر اونٹھے جس حرکت پڑے تھے۔ یہ تیسرا دن تھا جو انھوں نے کھو کر یا تھا اسی تھا۔

جول ۱۹۹۱ء

۴۹

اُور غریب بابا نے کلام جاری کیا۔ جب اندر میر اور طرف پھیل جائے اُور الگہر چوتا جائے تو جو تھی اسی سفری بیان کیا۔ اُس کے جانے سے شرمنادوں کو سفر کی پروگرامیت دی تھی۔ ... سفری بیان کیا۔

تب وہ عورت بڑھی جس کی گود میں بچہ تھا۔ اُور جس کے جوان سُدُول جسم کا انگ انگ سندھ تما میں ڈھلاتا۔ دہ چٹان کے آگے یوں کھڑی تھی جیسے دبومالائی اپر اگھاں سے نکل کر آئی ہو۔ مگر اس کی آنکھوں میں اُسی تھی۔ ہر لمحے کی طرح۔ اس نے بچے کو بابا کے چڑنوں میں ڈال دیا۔

گرودیلو کیا میری یہ سخنی سی جان جیوت رہ کے گی؟

لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں تو پیر بیٹ نہیں سمجھیں۔

بابا نے بچے کو اُور پھر عورت کو دیکھا۔ ڈر و نہیں۔ وہ یہاں تک آگیا۔ اسے کھونہ ہو گا۔ تم اکیلی ہو؟

"نہیں۔" وہ بولی۔ اُور سب سوچنے لگئے، وہ کون ہو گا جو ہوتے ہوئے بھی ایسی سندھی کے ساتھ نہیں! اُور جیسے دہ ان کے دلوں کی بات جان کر وہ خود کہنے لگی۔

اد رکھی سنگلائی پہاڑوں کی گود میں پتتے ہوئے صحرائی اُور کچی سنگلائی پہاڑوں کے اندر ...

کوکھ سے ابلجتے ہوئے سر دشیری چشمے کے پاک پانی کی جن کر کوشالا کے رانچ میں سادا تی کے تال کے اندر ...

اد رکھی سنگلائی پہاڑوں کی گود میں پتتے ہوئے صحرائی اُور کچی سنگلائی پہاڑوں سے فدر کر مایوس ہونا گناہ ہے۔ رب العزت نسل آدم کو زندہ رکھ لگا... تھارا نام ہے گا نہیں۔

مکر ہم نہیں جانتے ہم کون ہیں ا.... ہم بھول چکے ہیں، ہم کہاں سے چلتے تھے ا.... ہم خود پتے تھے یا نکالے جنستے ام۔ ایک بوڑھے نے کہا جس کی دار میں میں گھاس کے نکلے اٹھے ہوئے تھے۔ "سفر، سفرت ... ہم مسلم سفریں ہیں جانے کب سے ا ہمارا رہن سہن، ہماری اصل، ہمارا درثہ ... کسی کو کچھ یاد نہیں ہے۔ کون کیا تھا ابزرگوں کے نام تک بھلا پکھی ... اب ہماری نسل زندہ بھی رہی تو کیا وہ بیچاں جائے گی؟"

اد رپھر دہ بھی تو ہی جنہیں ہم پتے چھوڑتا ہے تھے ... وہ سب مددم ہو چکے ... ان کا کیا ہو گا؟

کسی نے پرچھا اُور خاموشی چھاگلی۔

اوہ سب لوگ سن سے ہو گئے۔ چپ چاپ بھٹی بھٹی نظر دل سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

شر من قفس بابا نے سندھی کے سر پر ہالہ بھیرا۔ ہاں جب بھی انسان براہی کے راستے پر بہت آگے بڑھ گی، شیطان جن گیا۔ وہ ایسی حرکتیں کرنے لگا جو جانور بھی نہیں کرتے! — اُور پھر دل الحقدس اس قوم کو نیت و نابود کرتی ہیں۔ اُور جوان کی طرف ہوتے ہیں، ان کو بچا لیتے ہیں اُور پھر ان ہم سے آدم کی نسل دنیا کو دوبارہ آباد کرنی ہے۔

شیرا حیران ہو رہا تھا، آج شر من بنا اتھی باتیں کیسے کر رہے ہیں! ان کی تو آواز بھی سننے کو کافی ترس جاتی تھی۔

تب نورانی داڑھی والے بزرگ نے کہا۔ محترم بابا

سب سے

یہ ان دونوں کی بات ہے، جب شرکار درپر تھی خیر کی حالت ۳۰ پہاڑی کے شکر میں کہا نہ ہوا۔ اسی اجنبی کی وجہ پر کامیابی کے لئے ربت الحزت کسی بادی کو بیسج دیتے تھے۔ وہ مسلم کب کاظم ہو چکا۔ اب کون نجات دیندہ آتے گا؟

قفس۔۔۔ شراسن ہوئے، وہ جب بجا زین پر اتنا ہے۔۔۔ فشی طاری ہوئے تھی، تب یہ یک آدمیان پر برداشترا برائیوں کے کوڑتے کر کٹ کر گھاس پوس کی طرح ٹلاکر را کھ کر دینا ہے۔ جو دُوری تھا میر کھنے ہیں اور...۔۔۔ میں سمیٹ یہ۔۔۔ اور پھر وہ سایہ گھر لگانی ہوتا گی اور مُشدابی۔۔۔

مگر قفس کو ٹھہرے! اب جاننا چاہئے تھے۔۔۔

اور اسکی لمبے شراسن بابا آنکھیں بند کیے چنان ہیں کھو گئے۔۔۔ چھالیں لوگوں نے آنکھیں پھالا۔۔۔ ہمارے کھنے کی بہت کوشش ہے۔۔۔ بڑی دیر بعد آنکھیں کھوئے بغیر جی بڑھانے لگے۔۔۔

وہ آگلے۔۔۔ اسے آنا چاہئے۔۔۔

سب لوگ خاموشی میں ان کو شکتے رہے۔۔۔

عزیز دو۔۔۔ تم چاروں طرف سے برائیوں کے نہر۔۔۔ ہر اتنے چاروں طرف دھرتی کا سیدھا دھوپ کی پیشوں آگ اور سیلان بیس مگر چکے ہو۔۔۔ اب نہ کوئی کشتوں آئے گی نہ۔۔۔ یہ جھٹا جا رہا تھا۔۔۔ جیسے سورج سوانح پر ٹھیک ہو۔۔۔ با تھا گلت کوئی نیاروپ دھاریں گے۔۔۔ لیکن خاطر جمع رکھو۔۔۔ اور پھر جب وہ پچھم کی پہاڑیوں کی طرف سر کئے گے۔۔۔ تب جو سب سے پاک ہے، اپنے نیک بندوں سے غافل نہیں رہتا۔۔۔ جسی سائے کی چھتری پہاڑی کے لوگوں کے سروں پر قفس آئے گا؛۔۔۔ اور ایک نئے قفس کو جنم دے گا۔۔۔ اور قائم رہی۔۔۔ میر علک بحق تقدیر کرے گے۔۔۔

ایک نئے یگ کا آغاز ہو گا۔۔۔

جاو۔۔۔ اور دعا مانگو۔۔۔ اور استغفار کر دو۔۔۔

ایور شراسن قفسی بابا کی آفاز ڈوبی چلی گئی۔۔۔ دو۔۔۔

تک گئے تھے۔۔۔ آنکھیں آپ ہی آپ بند ہوئی گئیں۔۔۔ اور پھر وہ جب ہو گئے۔۔۔ شیرانے بہت ہوئے سے انہیں زین پر لشادیا۔۔۔

وہ بہتہ دین پریتھے تھے۔۔۔ پتوں کے فرش پر۔۔۔

اور پھر جب لوگ ڈھلانوں پر ہے اور کہہ بہاڑی کی چنانوں اور جھانکاریوں کی جڑوں میں سو رہے۔۔۔

تیرا دل۔۔۔

یہ سے جسے سورج چڑھاتا گی اگر جی کی شدت بڑھتی گئی۔۔۔

دہاں نہیں جا سکا۔۔۔ اور پھر وہ دہاں ہوئے گے جی کہیں؟

ہٹھے جلتے..... دنوں چھتوں کیلئے تک منہ میں نہ رکھتے
... اور ایک بکھر اور ناریل کے ملکے سے فاقہ توڑ کر
پھر انکیں بند کرتے۔ رات کیسے گزارتے یہ کوئی نہیں
جانتا تھا۔ آج تک ان کے ساتھ رات کو کوئی نہیں رہا۔
اجانت بھی نہیں تھی۔

چوتھے دن ۔۔۔ وہی ہوا جو تیرے دن
جو انہا۔ ساری دھرتی تو سے پرچنے کی طرح بھتی رہی۔
بولاۓ ہوئے ڈھور اور پکشی گردنیں ڈال کر جہاں کے
تمہاں ڈھیر ہوتے گئے ۔۔۔ مگر پہاڑی پر سارا دن
سایہ چھایا رہا۔

لوگ خوش بھی تھے اور خوف زدہ بھی۔ نہ جانے
کون سا طوفان آنے والا ہے! کون سے روپ میں
راہش دھرتی کو نکل جانے والے ہیں۔
مگر انہیں امید بھی ہو چکی تھی کہ ان کی نیں باقی
رہ جائیں گی ۔۔۔ وہ نیک کی ڈگر پر چلتے آئے تھے۔

پانچویں دن شیرا الخیں بابا کے پاس لے گیا۔
اس دن جب گپھاؤں کی دیومالائی اپرائے
ڈلیا میں روٹی بابا کے سامنے رکھی تو انہوں نے شہد میں
ایک ملکڑا بھلکو کر کھایا۔ اور سب چہر دن پر ایک نظر ڈالی۔
— وہ قفس ہی ہے جو پہاڑی پر سایہ کیے ہوئے ہے
کیونکہ تم لوگوں نے پاک برتر رشتہ نہیں توڑا۔ اور نیکی
کو تھامے رہے، اور نہ رہتی دوافی سے اور سفلی مار توں
سے پر ہیز کیا؛ اور تمہاری نیں صحت مند شرپ اور
پاک و پاروں والی ہوں گی.... اور اب جملہ قفس
دھرتی پر نو دار ہو گی ہے، برا میوں کا غاثہ ہو جائے گا۔
— اور تم نہیں جانتے قفس کیا ہے۔ وہ پاکیزہ
ہنسیوں کا پرندہ ہے، جو صدیوں زندہ رہتا ہے۔ وہ
نہ نزہے اور نہ مادہ۔ فرشتوں کی طرح۔ تھا کائنات کی

قفس پہاڑا نے اپنے بیکے کر کے بھی عجیب مجھ چھی تھی۔
پہاڑوں کے اپنے گائے کے بعد چڑھائی بہت مشکل ہو گئی تھی۔
مشکل نوں پر قدم اوپنے نیچے پڑتے تھے۔ جھوٹے بڑے چھانی
پھر ایک روپرہر یوں رکھتے تھے، بیسے ذرا سے دھکے سے
روپک جاتا گے۔ اترتے وقت اور مشکل ہر دعا تھی۔

اک شیراڑی تھا جو درجہ اسی دے آ جاتا تھا۔
پہاڑی کی پستگ کے پاس کسی بہت پرانے شیو جی کے
دیوالی کے آنکھاں بھی تھے۔ پھر کی روپک روپی ہوئی سلیں
چھوٹتے ہے گریوں کے اندر اور پڑھی تھیں۔۔۔ اور وہیں
بھی کسی سادھکا بیگت کے چڑھائے ہوئے ناریل کا
سوکھ کشک خول بھی پڑا تھا۔

قفس بابا جس جگہ آ کر پہنچتے تھے، دراں سیتا پھل
کی بڑی جھڑیوں کا جھنڈ سا بن گیا تھا۔ اور انہی میں
دھنیتے ہوئے پھر وہ میں کھی ناگ۔ پس بھی ٹاگ آئے تھے۔
سیتا پھل اور ناگ پھن کا یہ میل عجیب تھا۔ خوفناک کانٹوں

کے بیچ خون کے رنگ کے سرخ پنڈو درپہنچتے رہتے۔ شیرا
کا کینا تھا کہ رات کو ان کے پیچے بابا ایک پیالہ رکھ دیتے ہیں۔
رات بھر ان کا رس پیالہ میں پیکتا ہے، سرخ...
زندہ خون جیسا۔ صح پوپھٹے سے پہنچے ایک بڑا راجناگ
ہمکروہ سارا سیتا لپی جاتا ہے۔ اور پھر اپنے چوڑے
پیس کی چھتری بابا کے سر پر کھوں کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب
پورب میں نر دی بھوکلکھوک سرخی کے چینتے بلکہ ریتی ہے تو
وہ راجناگ جانے کیاں غائب ہو جاتا ہے۔ آج بک
کسی نے اسے دیکھا نہیں۔

آج تک کسی نے بابا کو ناز پڑھتے بھی نہیں رکھا۔
جانے وہ کون دھرم سے ہیں۔ دن دون بھر انکیں بند کے
سکووان بھاکے آسن میں پیچے رہتے۔ تین ہنچ پدر چاریں
اسی طرح بت بنے، سانس روکے گزار دیتے.... بغیر

سب روں میں پرداز کرتا رہتا ہے۔ اور جب کوہاڈھیر پر
بدروں کا ران ہو جائے تو بہان دار دہراتا ہے۔ اور
وہ بڑا خوش نصیب ہے جسے وہ نظر آ جاتا ہے۔ اس کا سایہ
بھی پڑ جائے تو بھولے ہوئے کو راستہ مل جائے۔

اس کے پنکھے زور سے ہیں تو سندروں میں جوار جھائٹا
اچھا ہے۔ ہوا کی لبردی میں درخت چکنے لگیں۔ اسی یہے
دھرتی کے نزدیک ایسے دھیرے دھیرے اڑتا ہے کہ آواز
بھی نہیں آتی۔۔۔

اس کی چونچ میں بانسری کی طرح سوراخ ہوتے ہیں
کسی سنت صوفی نے ان سوراخوں کی تعداد تین سو اٹھو
بنائی ہے۔ ان میں شریح اور نشادہ کی پیچ سارے شدھ
اور کومل سروں کے راگوں کا ساگر بند ہے۔ جب ان سوراخوں
میں سے ہوا گزرتی ہے تو چاروں کھونٹ سنگت کی برکھا ہوگی۔
اور اس دن شیرا کو پہنچلا کہ شرامن بابا کو
تفقیں بابا کیوں کہتے ہیں۔

بابا کے جارہے تھے۔ بائیوں کا نامس کر کے نئے
میگ کو جنم دینے کے لیے بوڑھا فقیس خود کو جلا کر راکھ
کر دیتا ہے۔ اس کے لیے وہ سوکھے پتوں کا ایک ڈھیر
تیار کر کے اس پر بیٹھ جاتا رہتا، اور جو چونچ کی بانسری پر
ایسا پر سوز راگ چھپ رہتا ہے کہ ہوا میں شعلے پکنے لگتے ہیں۔
اور پتوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ وہ خود بھی جل کر بھیم
ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی راکھ سے نیا فقیس پیدا ہوتا ہے۔
اور پوتھے سار پھر جنم دیتا ہے۔

اور جب تھاگت ہرن یادی پار کر کے کوئی نہ
پہنچ تو انیس انتر گیان پر اپت ہو چکا تھا کہ ان کا آخری وقت
اگیا ہے۔ وہ ترشنہ کے سارے بندھنوں سے مکت ہو چکے
تھے۔ اور ان کے شریر نے بھی ان اور جل سے مکنی لے لی۔
اور انھوں نے آئندہ سے کہا کہ ان کے لیے جنگل میں سال کے

دو پیڑوں کے پیچ پتوں کا دھیر ٹکڑا اور اسے سوچ دن کا
انتم بستر ہو گا۔ اور پتوں کے دھیر کو سونے پر لکھی اتکا شری
کو جوڑ کر اس ستم کی طرف اور اٹھاتی آجہاں تکہ اور
دکھ ایک ہو جاتے ہیں۔۔۔ اور ان کے بے جان شری
پر پیڑوں نے بھول بر سائے حلا لکھ دے پتوں کا سوچ
نہیں تھا۔ اور ان کے شانت چہرے پر بھی کم ٹکڑا تھا
۔۔۔ پس نیک بندوں میں پر پتوں کا دھیر صح کر د
اور پھر بابا میکھت چپ ہو گئے۔ اور جب بابا ہے
۔۔۔ کسی کو ان سے پوچھنے کی بہت نہیں ہوئی کہ وہ پتوں
کے ڈھیر پر کیوں بیٹھے ہیں۔۔۔
اور آ کا شری ہے آئی ہوئی اپر اسے شیخیر کی
طرف دیکھا تو اس نے ہو لے سے گردن پلاک رہا اس تھا۔
اور پھر اپر اسے شرامن فقیس بابا کو بہت دھیر سے
پتوں پر بھائی دیا۔ جیسے ان کا ہمین ناٹک بدن ذرا
بے دھکتے سے کامیکی طرح جنم جائے گا۔
اور شرامن بابا نے ہاتھ سے سب کو جلے جانے کا اشارہ
کیا۔ اور سب چپ چاپ نیچے چلے آئے۔
ان کے دلوں میں عجیب ہل چل پھی ہوئی تھی۔ ان کی
بھکری نہیں آرہا تھا کہ.. کیا پیچ پیچ بجات کا سمجھے آگیا؟
تو پھر۔۔۔ یہ ہوں کیسی؟
چنان اسی خوف اور ایسے کے درمیان کٹ گیا۔
مگر اس دن دھوپ نہیں نکلی۔ دھوں انمار بارش ہونے لگی۔
کامی بادلوں کے گستاخ توب اندھیرے میں ہر شے مٹھن لگتی تھی۔
۔۔۔ بارش کا زور بڑھتا رہی گیا۔ آسمان میں پھر پھر چلتے۔۔۔
رات کو بھی زور نہیں ٹوٹا۔ پھر اسی کے باسی خرا اور ہو چکتے۔
اویکڑوں بیٹھے بیٹھے ان کے پاؤں شل ہو گئے تھے۔
بھلی چکتی تو پہاڑی کے چاروں طرف اونچا ہو چکا۔
کو دیکھ کر خوف سے آنکھیں بند کر لیتے۔ اور بت احرارت کی

جول ۱۹۹۱ء

۷۳

بادل کھلنے لگے۔ اور لوگوں نے دیکھا کہ ساتواں دن کب سے

شروع ہو چکا؟

عقلت کے کچھے دہر نے لگتے۔
قفس بابا پر کیا اگر رہی ہوگی؟ کسی نے شیر سے پوچھا
وہ بھائی سوچ رہا تھا۔

اور انھوں نے دیکھا، جاروں کی طرف سندھ میں مار دی
ہے۔ اور پیاری ایک جزیرہ بنی محڑی ہے۔

اور شب سب کے دلوں میں ایک ہی خیال آیا۔
قفس بابا؟

اور جب دہان پہنچے تو دیکھا، وہاں پکھ بھی نہیں ہے...
پر طرف کلوں کے کالے دھیے پھیلے ہوئے ہیں اور پھیلے ہوئے
پتوں کافرش ہاگ میں جملس کر جائز ہو گیدے۔ سیتا پہل کی
جنی ہوئی ہنسیاں ٹوٹی پڑی ہیں۔

بaba کا گھیں پستہ نہ تھا!
اور تب یہ ہوا کہ ہر ایک نے اک دم گردن اٹھا کر اسماں
کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی چیز اڑتی ہوئی ان کے پاس سے گئی ہو!
اور ان کی نگاہیں اسے دیاں تلاش کرتی رہیں۔

(سلسلہ "پہلی بات" ص ۲) حضرت میکش اکبر آبادی کی دفاتر سے
وہ چنان بچھ لگایا جو رہنمائی کی مخالفوں کی روشنی تھا۔ وہ ایک بڑے علم
صوفی، نقاش اور شاعر تھے۔ ان کا ذوق شعر و ادب فانی بدایوں،
سیماں اکبر آبادی نبیل نہم اور مانی جائی کی مخالفوں میں پروانی جڑھا
ان کا گھر طالیاں حق کے علاوہ ادیبیں اور شاعروں کا مر جنم بھی تھا۔
وہ ایک عمدہ شاعر تھے۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے نظر ہوتے
اور دوسرے نام شاعر کے نام نے شائع ہوئے۔ یہی انھیں زیادہ
خبریں اتنا کی تصنیف "نقد اقبال" کی وجہ سے حاصل ہوئی جو
اتیالیات میں ایک بے یہاں اضافہ ہے۔

ضمیر الدین احمد کالندن میں گزشتہ دنوں انتقال ہو گیا جو
بھی پہلے جب ان کی ابتداء کہانیاں شائع ہوئی تو باذوق قارئین پہنچ
پڑتے تھے۔ یہی کچھ عرصہ بعد وہ ادب کی دنیا سے درہوکے اور ان کی
طبلی غیر حاضری نے اس کا نام ذہنوں سے محکر دیا۔ چند برس قبل ان کی
مراجعةت ہوئی اور پے درپے چند لینڈ بائی کہانیاں انھوں نے تخلیق کیں۔
موت نے ایک بے پناہ افسانہ نگار کو ہم سے چھین لیا۔ اس کا جتنا
بھی افسوس کیا جائے کہ ہے۔

مخفی بستم

سب سے پورے آدمی نے کہا کہ اس نے سب سے بڑھے
آدمی سے سنا تھا، پس پہلے بھی ایسی ہی بارش ہوئی۔
مگر یہ طوفان کب تھے گا؟ اندھیرے میں پھر کسی نے

پوچھا، اور پھر کسی نے جواب نہیں دیا۔
اور پھر سب چونک اٹھتے۔ بارش کی آواز میں ایک اور
آواز بھی شامل ہو گئی تھی... باریک، بیکیل۔ جیسے کہ
تاریخی سرروں میں بانسری بخار ہا ہو۔

قفس!... کسی نے سرگوشی میں کہا۔
اور کسی نے سانس روکے زیر پتہ دہرایا۔ قفس!
مگر بارش میں قفس کے نگت کا کہا مطلب! —

بھی پڑے پتوں میں آگ کیسے لگ سکتی ہے؟ اور پھر...
یہ آواز تو بہت دور سے آرہی تھی۔ مگر تھا میلوں دور سے!

سب نے اپنے پر ٹکھوں کو یاد کیا جو پھر پہنچے تھے۔
س فیو، کو یاد کیا جو سفر میں چھوٹ گئے تھے... اور روح الفدر
کی مرح سرائی کرنے لگے... کیونکہ وہ اس کے نیک بندے تھے

کیا ساتواں دن شروع ہو گیا؟ — مگر اس دفعہ
بھی کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس لیے کہ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا
اندھیرا تا اگر اتحاک کے دن کے نکلنے کا بہتر کیسے چلتا!

اور پھر یہ لخت بھلی اتنی زدہ ہے چکی کہ دل دہل گئے۔
پانھوں نے کانوں کو ڈھنک دیا۔ اور چھک سے اتنی تیز راشنی ہوئی
کہ پہل بھر کو دنیا چکا چوند ہو گئی۔ آنکھیں چند میا گئیں!

اور بہت دیر تک گرج کی گوئی پیاروں سے ملکا کروٹھی رہی۔
جیسے چٹانیں ایک دوسرے پر رُحکتی جا رہی ہوں۔ اور لوگ
سجدوں میں گر گئے۔ جلدی بھلی کہاں گری ہے؟

مگر اس کے بعد اندھیرا چھٹنے لگا۔ بارش رکھی گئی۔ اور

محمد نور الدین خاں

بیرونی مشاہیرِ ادب اور حیدر آباد

(ڈاکٹر داؤد اشرف کا تحقیقی کارنالس)

سب سے بڑی اہم ترقی یافتہ دینی ریاست تھی۔ علم و ادب کی سر پرستی اس کا مطہرہ استیاز تھا۔ مشاہیر علم و فن اصحابے ہند سے پہنچ کر حیدر آباد آتے اور وہ تاجدار ان آصفیہ کی ملی میاضی اور معارف نوازی سے مشرف اور فکر معاش سے مطمئن ہو کر گران قدر علمی خدمات میں مشغول رہتے تھے۔ جن کی شہرہ آفاق تھائیف سے ایک زمانہ مستفید ہو رہے ہیں۔

علیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیٰ خاں آصف سادس اور اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علیٰ خاں آصف سابع نے خدا صرف ان شاندار روایات کو برقرار رکھا بلکہ اپنی علمی فیضیوں کی ایسی حیرت انگیز مشاہیں قائم کیں جن کی نزیر سلاطین سلف میں نہیں ملتی۔ ان بادشاہوں کے پادھیاں کارناۓ یقیناً تاریخ کا قیمتی سرمایہ ہیں جو آج بھی تحقیقیں دعویٰ صین کی دسترس میں پیدا کر دے گیں۔ ان تاجداروں کے دور حکومت کے پانابند مکمل سکون اور دینی مصائد کے پیکار ڈینے کا تم تحریر خدمات کے باطل

تاریخ شاہد ہے کہ شاہان وقت، روسا اور امراء نے بہشتہ بلا لحاظ مذہب و ملت، علم، شعر اور فنکاروں کی بڑی قدر دالتی اور سے پرستی کی ہے۔ ان کے رفاهی کارناموں کے نقوش تاریخ کے صفحات پر مرسم ہیں۔ مغلیہ دور کے بعد عادل شاہی، برید شاہی، نظام شاہی، قطب شاہی بادشاہوں اور دیگرانگر کے راجاوں نے بھی علم و فن کی ترقی میں جس فراخ دلی سے حقہ دیا ہے، اس کی رو داد تواریخ اور شعر اکے قصیدوں میں محفوظ ہے۔

غور طلب اور تعجب کی بات یہ ہے کہ دکن کی ذکورہ بالا بادشاہیں، صدیوں بڑی شان و شوکت سے قائم رہنے کے باوجود ان کے دفاتر کا کوئی سرکاری اور دہیاری کارڈ دستیاب نہیں ہے، جس کی وجہ سے بعض خود ساختہ افغان نے اور مضمون خیز واقعات جو دنماںی اختراع کے سوا کچھ نہیں، بادشاہوں سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ جن سے اس دور کی تاریخیں خالی ہیں۔

ملکت آصفیہ حیدر آباد سائبی میں بڑھنے والی

جول ۱۹۹۱ء

۲۵ کا دائرہ ان مشاہیر کی حیدر آباد سے دارالشیعی بسلسلہ ملازمت یہاں قیام اور پھر غلطیہ پر علاحدگی تک تفصیلی رواداد اور ان کے علمی و ادبی کام کے لیے شلمانہ سرپرستی اور گران قدر ذہانی اور بعض فضی واقعات تک محدود ہے لیکن ان سارے واقعات کو بڑے حسن و خوبی اور وفاحت سے آر کائیوں میں محفوظ ریکارڈ سے معاملہ و سواز نہ کرتے ہوئے ان پر نقد و تبصرہ کیا ہے۔

قابلِ مؤلف نے صرف ریکارڈ ہی دیکھ کر منفایں نہیں لکھے ہیں بلکہ ان تمام مشاہیر شعر و ادب کی سوانح عمریں اور تذکروں کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ نیز ان سے متعلق لکھنے تحقیقی مقالوں اور مफایں کو بغور پڑھا ہے اور پھر آر کائیوں ریکارڈ کی روشنی میں ان کو جانچا پر کھا اور ان غلطیوں اور فروگز اشتوں کی نشان دہی کی، جو دانستہ یا ندانستہ خود ان شخصیتوں یا ان کے مقابلہ نگاروں سے سرزد ہوئی ہیں۔ اگر وہ بعض غلطی ہائے منفایں سے پرداہ نہ لٹھاتے تو غلط فہمیوں کی وجہ سے اصل حقائق پر دہنے میں رہتے۔ منفایں کے آخر میں مشاہیر کی درخواستوں، بعض خود ریکارڈ اور فرمائیں کے زیر اکس رکھنے، بھی پیش کر دیے ہیں اور تحقیق سے رپورٹ رکھنے والوں کے استغفار کے لیے امشدہ اور ریکارڈ کے نمبر و نشان بھی تباریے ہیں۔ بعض ایسی سخن گستاخہ باتوں کا انکشاف بھی قابل سوونف کو کرنا پڑا جو بیان نہ ہوئیں تو حقائق سامنے نہ آتے۔ مثلاً جناب جوشی ملیح آبادی نے ربانی مشہور و معروف سوانح عمری "پاروں کی بارات" میں ریاستِ حیدر آباد میں اپنی آمد، ملازمت اور پھر پیاست حیدر آباد سے اخراج کے واقعات بہت سمجھ کر کے اپنے شخصی کردار کو ایک فیاض اور علم پرور بارشاہ کے مقابلے میں نہایاں کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جناب جوشی سے متعلق دون منایں ہیں جو شیخ ملیح آبادی کی دارالترجمہ

سب رسن رفاقتی اور علمی فیاضیوں کی رواداد، احکام و فرماں اور ہزاروں لاکھوں تاریخی اسناد و کاغذات آج آندھرا پردیش اسٹیٹ آر کائیوں میں محفوظ ہیں۔ نامی گرامی مقامی و بیرودی علیہ مشاہیر ادب، شعر اور اہل کمال کی قدر دانی و سرپرستی ان بادشاہوں کا دلپڑہ رہا ہے جو تاریخ کا درختان کا رنامہ ہے۔ جس کی تفصیلات بہت دلچسپ، حیرت انگیز و معلومات افزائیں۔ افسوس کہ انقلابِ زمانہ نے ریاستِ حیدر آباد کی بساطِ حکومت الٹ دی اور اہل زمانہ کے لیے یہ سب گئی گزری اور بھولی بسری باشیں ہو گئیں لیکن تاریخ کا یہ بیش قدمت سرمایہ لاکھوں امیتله کے انبار میں دبا پڑا ہے، جس سے موجودہ دور کے تحقیقین اور دیرینہ اسکالر وہت پکھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگرچہ بعض علماء کے تذکروں میں حیدر آباد کی علمی فیاضیوں اور اہل علم کی شاہانہ حوصلہ افزائیوں کا ذکر ملتا ہے لیکن وہ اتنی بھی اور تشعہ تحقیق ہے کہ اس سے حیدر آباد کی علمی سرپرستیوں کی صیغہ تصور سامنے نہیں آتی۔

یہ خوشی کی بات ہے اور قابلِ مبارکباد ہیں جناب داکٹر سید داؤد اشرف صاحب ریسیرچ آفیسر آندھرا پردیش اسٹیٹ آر کائیوں جنہوں نے اس گنجی مخفی سے اعلیٰ حضرت آصف جاوہ سابع کی بی مثال فیاضانہ اور شاہانہ سرپرستیوں کے آب دار موتیوں سے اپنی بیش بہا تایف "بیرودی مشاہیر ادب اور حیدر آباد" مزین کر کے مولانا عبد الحکیم شری مولانا ظفر ملی خاں، مولانا شبیلی نعیانی، مولانا سیفیان ندوی مولانا عبد الماجد دریا آبادی، مولوی مزراہا دی رستوا، جسے نامور موڑخ دادیب اور خاتی بدایوںی، جو شیخ ملیح آبادی اور حبیظ جالندھری جیسے مشہور زمانہ شعر اور تحقیقی منفایں کی شکل میں ملک کو ایک نادر تھنہ دیلے ہے۔ اگرچہ اس منفایں

سے میں ملازمت اور جو شریع آباد کاریاست چھڈ رہا ہے خون۔^{۱۰}
ان کی اعانت کی اور اس امداد رہی ہے دو تاریخی کا لذتیانی
کارنامہ ہے۔ ان مصنفین کو ان کے علمی و فقیحی پر بحث
کے پیغمبر جو درہ سال تک ان کے شایان شان و فلسفت سے
سرفراز کی آگی اور پھر ان کی ذات کے سوا ان کے عالمگرد
دار المصنفین کوئی ماننا نہ مستحق ذلیلہ چار کوہا بیکن یہ بھی
بڑے تجھب کی بات ہے کہ غور مولانا سیمان ندوی صاحب
سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد اول اور جلد بیجم کے
دیباچوں میں فرمائیں جو پال سلطان جہان دیگر
کی شاہانہ امداد دو صور پر یہ ماننا، کا ذکر تو بہت قیدت
سلطانی اور شان دار انفلان میں کیا ہے اور حضور نہماں امداد
سابع کی فیاضانہ امداد کا یوں ہی سرسری ذکر کیا ہے۔

ہم یہ کہے بغیر خیس رہ سکتے کہ ان مصافیں کو بڑھنے
کے بعد حضور نہماں عالی مقام آصف سانی کی خصیت کے
چند ہبہوں باگز ہوئے ہیں۔ وہ ایک خود مختار پادشاہ ہوتے
کے باوجود کوئی حکم نافذ کرنے سے پہلے ہبہ اپنی کو نسل
ر مجلس ذرایع کی رائے معلوم کرنا ضروری بھتتے تھے اور کو نسل
کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے اگرچہ پادشاہت تھی
مگر طرز حکومت جمہوری تھے قدر دادی علم و فن کا یہ حال
تھا کہ جناب فاتح بدایوں کو ملازمت دینے کے خواہانے تک
قانون کو نظر انداز کر کے استثنائی حکم دیا۔ سب سے قابل
اور متاثر کن بات یہ ہے کہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی
تاپیٹیکے دوران حکومت چند نے رینڈیٹ کے ذریعے
محلف بہانوں سے دار المصنفین کی امداد جو حکومت سرکار طی
کی جانب سے جاری تھی مدد کرنے کے لیے آصف سانی
پر دباؤ ڈالا میکن آپ کبھی اس کو خاطر میں نہیں لائے اور
رینڈیٹ کو یہ اطلاع دینے کا حکم دیا کہ جس کام کی
تجھیل کے لیے دار المصنفین کو رقم دی جا رہی ہے وہ ایکستہ
کام ہے، اس امداد کو روکا نہیں جا سکتا یا اس نہیں ہے۔

سے میں ملازمت اور جو شریع آباد کاریاست چھڈ رہا ہے خون۔^{۱۰}
میں پیش کردہ ریکارڈ اور اس معانی نامہ کو جسے حباب
جو شش نے حضور نطفہ کی خدمت میں پیش کیا تھا پر جو کہ
جو شش کی غلط بیانی کی فلکی کھل جاتی ہے۔ لوگ فرشتوں کے
لئے پر بکڑے جاتے ہیں لیکن جناب جو شش خود اپنے کھے پر
پکڑے گئے ہیں۔

ان مشاہیر شعر و ادب کے سوانح صیات پر محققین نے
تحقیقی کام کیا ہے لیکن زیر تبصرہ کتاب کے مطلع سے ثابت
ہے کہ ان کے تحقیقی مقالوں میں حیدر آباد میں ان کے قیام
کی مدت اور ریاست چھڈ رہا باد کی جانب سے ان کی عملی
خدمات پر جو گزار قدر فٹاٹ ملتے تھے، اس کا ذکر کسی میں نہیں
حوالہ مولانا ناظر علی خاں کاریاست میں قیام یقول فاضل
مولف نصف صدی سے زیادہ رہا اور مولانا عبد الحليم شریڑ
نے پہاں چودہ سال گذارے اور شاہزاد اعلیٰ دعائیات
سے بہرہ مند بھی ہوئے۔ یہ ناسپاسی نہیں تو کیا ہے کہ
سیرت نگار نبوی مولانا سیمان ندوی اور مولف صیات سیمال
نے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف کے سلسلہ میں ریاست
حیدر آباد کی بیش بہا امداد و اعانت کے بارے میں کہیں ذکر نہیں کیا۔
مولانا شبیلی نعمانی سے متعلق دو مصادر بطور فاص

بہت اہم اور معلومات افزائیں۔ پہلی مرتبہ پہ معلومات منتظر ہا
پر آئی ہیں۔ جو اب تک محققین کی نگاہوں سے غافل تھیں۔ یہ
انکشاف اہل حیدر آباد کے لیے باعثِ فخر و سبالات ہے کہ
سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم تصنیف کا نامے کی سعادت
بھی دولت آصفیہ کے حصے میں آئی۔ موتخ اسلام د
عالم دین مولانا شبیلی نعمانی اور ان کے لائق شاگرد مولانا
سیمان ندوی نے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیل و
تدریج چھو جلد وں میں کی۔ اس عظیم اثاثان تصنیف کی تکمیل
کے لیے آصف سانی نے جس فراخ دل اور جوش ایمان کے

شوئی اپنے بزرگوں سے دستی میں ملا ہے جیسا کہ اپنے پیش نظر میں محترم جناب عابد علی خاں صاحب نے بتایا ہے کہ میدانِ ادب میں وہ نوادراد اور نوآموز نہیں ہیں۔ لیکنے کا شوق اور تحقیق سے دلچسپی، انھیں شروع سے رہی ہے۔ جب وہ ایم اے میں زیرِ تعلیم تھے تو شاعرِ انقلابِ خندوں میں ایام کے حالاتِ زندگی کی نشستوں میں خود خندوں سے دریافت کر کے مرتب کیے۔ ان کا یہ مقالہ ۱۹۶۸ء میں خندوں ایک مطالعہ کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ جس کی خود خندوں نے تعریف کی تھی۔ اس طرح خندوں پر ان کا یہ مقالہ ایک مستند کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کی دوسری کتاب "اور کچھ بیان اپنا" ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی جو، ان کے تقدیمی اور نشری تقریروں کا مجموعہ ہے اور ان کی ناقلانہ صلاحیتوں اور شعرو ادب کے اعلیٰ ذوق کی عکاسی کرتی ہے۔ فاضل مؤلف کو اپنی اس گراں مایہ اور قابلِ قدر تالیف کے دوران جن صبر آزماؤشوں سے دچار ہونا پڑا ان کا اندازہ کرنے سے ہم قامر رہتے اگر وہ خود اس کا اظہار نہ کرتے۔ آغازِ کتاب میں "گزارش، احوال واقعی" کے زیرِ عنوان دہ لکھتے ہیں "ارب میں مستند اور مکمل تحقیق کے نونے پیش کرنے اور ان دیکھنے گو شوں پر سے پڑے پر دوں کو ہٹانا کے لیے بڑی ریاضت اور عرقی ریزی مستقاضی ہوتی ہے اور پھر جھان میں، تصدیق اور توثیق اور تجزیہ و تقابل کے پے خاص منطقی اور سائنسی طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ تلاشِ خود ایک ریاضت ہے۔" (ص ۷) ان کے اس بیان کے بعد اس تالیف کی قدر و اہمیت بڑھ جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کس قدر تحقیق اور حخت سے لکھی گئی ہے۔ جناب ڈاکٹر صاحب اپنے مکھی کے ایک ذمہ دار عہدہ دار ہیں۔ سرکاری فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ وہ طالب علموں اور سیرج کا کام کرنے والوں کی نہایت مستعدی

جس کے انہیں زندگانی کا اقتدار و حلقہ پر تھا، برخلاف اس کا اہم حکومت گروائیک والی ریاست کا بے باکانہ جواب دینا قوتِ یہاں کا ناظہر نہیں تو اور کیا ہے۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر آصفِ سابع کے جوشیں رہائی اور بجزاً ات مندانہ اقدام کی ستائش کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ "آج کے دور میں کون نہیں جانتا کہ ماتحث حکومتیں کوئی ایسا اقدام کرنے کے لیے کبھی تپار نہیں ہوتیں جس سے ان کی بائی گسان کی پیشانی پر بل پڑیں۔" (ص ۸۳) ان تمام منصائر کے پیشتر میں اور پیش کردہ ریکارڈ کے آئینے میں وہ تمام تنقید نگار اپنے اصلی روپ میں نظر آتے ہیں جو حضورِ نظام کو طرحِ طرح سے بد نام کرنے کی متعقبانہ مذموم کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ مشتمل نونہ از خر وار سے ہے۔ ورنہ آر کائیوں کے مصدقہ ریکارڈ میں حضورِ نظام کے آئین حکومت میں عدل و انصاف، رہایاکی خوشحالی اور بلالحاظِ مذہب و ملت امداد کی ایسی روشن مثالیں میں گی کہ آج کے جہوری دور میں بھی ان کا تعزیر نہیں کیا جاسکتا۔ فاضل مؤلف نے "گزارش، احوال واقعی" میں آندھرا پردش اسٹیٹ آر کائیوں میں حفوظ ریکارڈ کے ذخائر اور ان کی تاریخی اہمیت و نوعیت کا تعارف بھی مختصر مگر جامع الفاظ میں کیا ہے۔ خاص طور سے آصف جاہی دوسرے کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا بیان بڑا ہم ہے کہ تقریباً دو سو سال کی مدت پر پیر ریکارڈ میٹھے ہے اور ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد ایک کروڑ ہے (ص ۹) کتب خانوں کی سیر کرنے والوں اور آر کائیوں سے ناواقف حضرات کے لیے یہ ناقابلِ نقیبیات خود رہے مگر مؤلف نے ایک ذمہ دار سیرج آفیسر کی چیخت سے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ جناب ڈاکٹر سید داؤد اشرف صاحب کو علم و ادب کا

اردو کا عہد ساز رسالہ

سوچات

مدیر:- محمود ایاز

پہلی کتاب جولائی کے اوآخر میں
ایک تخفہ اس مشتی ہوئی اقلیت کو جو ادب کو ایک طرزِ حیات سمجھتی ہے۔

چند لکھنے والے :- شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، فاہد علوی، نیز مسعود، محمود بخشی، شیعیم احمد
مخنی، بسم، عزیز حامد مدین، باقر مہدی، ساقی فاروقی، وزیر تقی، عبد العزیز خالد
عرفان صدیقی، محمد علوی، خلیل مامون، کاوشن بدربی، صلاح الدین پروز، امداد فخری
اور کئی۔

ضمیر الدین احمد کے سات افانے جن کی گونج برسوں سنائی دیتی رہے گی۔ ان پر نیز مسعود کا تصریح
اختر الاریمان کی خود نوشت "اس آباد خلابے میں... " کے درباب
شخصیت اور شاعری پر ایک گوشہ۔ ایک مکالمہ، اختر الاریمان اور محمود ایاز
خاکہ، جیل الدین عالیٰ اور بہت کچھ۔

صفات:۔ تقریباً ساٹھ چار سو (۲۵۰) قیمت اسی روپے
صرف دیا پاپی کے ذریعہ پست

"SOUGHAT"

No. 84, 3rd MAIN 2nd CROSS DEFENCE
COLONY INDIRA NAGAR, BANGALORE - 560038

June 1991

R. No. 10922/57

Regd. H/HD 134

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 482 (A. P.)